یادِ و بودِ غالب

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک۔ ا، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066

یادِ وَ بُودِ غالب

یادِ و بُودِ غالب

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک۔ا، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے اُن اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدارسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب

ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نے مختلف علوم و فنون کی جو کتابیں شائع کیں ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے اب ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا پروگرام شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہلِ علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند، نئی دہلی

فہرست

۱ :-	غالب کی عظمت	۹
۲ :-	غالب اور بے صبر	۱۷
۳ :-	غالب اور آزردہ	۲۸
۴ :-	غالب کی شخصیت اور شاعری میں ترکی ، ایرانی عناصر	۳۷
۵ :-	غالب کا مقدمہ پنشن	۵۶
۶ :-	غالب کے چند غیر مطبوعہ فارسی رقعات حضرت غمگین کے ساتھ	۷۱
۷ :-	غالب کا سکہ شعر	۸۱
۸ :-	معرکۂ غالب و حامیانِ قتیل ایرانی ، ہندی نزاع کی روشنی میں	۹۶
۹ :-	غالب کی دلّی	۱۱۵

غالبؔ کی عظمت

آج کا دن ہماری تاریخ ادب میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے، اس روز اقلیمِ سخن کے تاجدار مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کا انتقال ہی نہیں ہوا، بلکہ پورے ایک دور، ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا۔ یہ دور عبارت ہے فیضی اور رحیم کی شاعری سے، عبدالصمد کی مصوّری سے اور سیکری اور تاج محل کی صنّاعی اور خوبصورتی سے، مرزا غالب اس محفل کی آخری شمع تھے، لیکن وہ ایک دور کے خاتم ہی نہیں، ایک نئے دور کے پیش رو بھی ہیں۔ ادب میں جو نئی بنیادیں انھوں نے قائم کیں، جدید نثر اور جدید شاعری کا ایوانِ رفیع اسی پر تیار کیا گیا ہے۔

مرزا غالب نے جس وقت ہوش کی آنکھ کھولی، مغلیہ سلطنت کی شمع ٹمٹما رہی تھی؛ لارڈ لیک کی فوجیں دلی تک پہنچ گئی تھیں، انگریزی نظم و نسق قائم ہوچکا تھا اور شہنشاہِ عالم اور عالمیان کی حکومت قلعہ معلّی تک رہ گئی تھی، پرانا نظام کمزور اور بے دست ہوگیا تھا اور نئے کی گرفت دن بدن مضبوط ہوتی جاتی تھی، لیکن ابھی قدیم نظامِ حیات کی دلکشی کم نہ ہوئی تھی بلکہ تبدیل شدہ حالات نے اس محبت کا ایک نیا جذبہ پیدا کردیا تھا۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ آویزش اور پیکار تھا جو اسماعیل شہید سے شروع ہوکر غدر پر ختم ہوا۔ غدر سے مرزا غالب کی وفات تک پرانا نظامِ حیات درہم برہم تو ہوتا رہا لیکن نیا وجود میں نہیں آیا۔ پرانی قدریں مضمحل ہوکر ختم تو ہونے لگیں لیکن نئی

وجود میں نہیں آئیں، اس وقت نقش جادہ ناپیدا تھا اور زندگی منزل و محمل سے بے نیاز تھی۔

اس شکست اور اضطراب کے زمانے میں، جب موجِ خوں ہمارے سر سے گذر رہی تھی، مرزا غالب نے دل میں سرور اور آنکھوں میں نور پیدا کیا انھوں نے زندگی کی تکلیفوں پر رنجیدہ ہونے کے بجائے اس کا ایک حوصلہ اور ایک ہمت عطا کی، انھوں نے تیرگیِ شام کو نورِ سحر قرار دیا اور اس طرح ہمیں ظلمت کے برداشت کرنے کا اہل بنا دیا۔

غالب کی پرورش نہایت شاندار ماحول میں ہوئی تھی، جہاں عیشِ امروز کے سارے وسائل و ذرائع موجود تھے یعنی شاہد و شمع و مے و قمار، لیکن یہ فضا مادی ترقیوں کے لیے سازگار نہیں تھی، اب سرلشکری کا موقع نہیں تھا، صرف سخن گستری کا موقع تھا، اس لیے انھوں نے اپنی آرزوؤں کے پورا کرنے کے لیے شعر و سخن کا راستہ اختیار کیا جس کا ذوق وہ ازل سے لائے تھے۔ وہ خود کہتے ہیں "آئینہ زدودن و صورت معنی نمودن نیز کار نمایاں است"۔ یہی وجہ ہے کہ تورانیوں کا علم ان کے قلم میں تبدیل ہوگیا ہے، اس قلم میں تلوار کی سی تیزی اور بُرش بھی آگئی ہے جس آزادی اور جرأت کے ساتھ مولانا اسماعیل شہید نے اپنی اصلاحی تحریک شروع کی تھی، اور رسوم و معاشرت میں تقلید کی بُرائی، اسی آزادی کے ساتھ غالب نے فنِ لغت اور فنِ شعرگوئی میں استادوں پر آزادانہ نکتہ چینی کی ہے۔ وہ خود کہتے ہیں " ہر پرانی لکیر صراطِ مستقیم نہیں ہے " اور اگلے جو کچھ کہہ گئے ہیں، وہ پوری طرح سند نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ مرزا غالب نے شعر و ادب میں ماضی کے سرمایے سے قطع نظر نہیں کیا، حال کی ضرورتوں کا لحاظ رکھا اور مستقبل کے لیے وسعت پیدا کی۔ عبدالحق صاحب نے صحیح فرمایا ہے کہ اگر غالب نہ ہوتے تو حالی اور اقبال بھی نہ ہوتے۔ یونان کے دیوتا کی طرح ان کا ایک رخ ماضی کی طرف ہے اور دوسرا مستقبل کی طرف۔

غالب غیر معمولی شخصیت کے حامل تھے، ان کی عظمت کا راز ان کی رنگا رنگی، ان کی دلکش انفرادیت، ان کی انسان دوستی اور ان کی آفاقیت میں پوشیدہ ہے۔ وہ

بڑے شاعر ہوتے ہوئے بھی ایک بھرپور انسان تھے، جس میں بہ تقاضائے بشریت خوبیاں بھی ہیں اور خرابیاں بھی۔ انھوں نے کبھی اپنی شخصیت پر تہ بہ تہ نقاب نہیں ڈالے اور پردے کے نقش و نگار کو حقیقت باور نہیں کرایا۔ وہ جیسے ہیں اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں، یہی بیباک صداقت، مہذب رندی اور سنجیدہ ظرافت اردو ادب کا سب سے بڑا سرمایہ ہے" انھوں نے نئے نظام اور نئے زمانے کی اس وقت تائید کی جب سر سید کو بھی اس کی جرأت نہیں تھی" انھوں نے قتیل، برہان قاطع اور نواب کلب علی خاں کے جوابات اسی طرح دیے" جس طرح ترک اور تورانی لڑتے ہیں" کسی جگہ انھوں نے اپنی انفرادیت کو مجروح ہونے نہیں دیا۔

اس پُر آشوب زمانے میں خود مرزا کی زندگی بڑی پُر آشوب گذری، وہ آگرہ کے خم کدۂ نیاز سے نکل کر دلی آئے تو یہاں شاعروں سے معرکہ آرا ہوئے، انھوں نے ذوق کی لسانی تحریک کو مانا لیکن اس کو حکیمانہ نظر بھی دی۔ کلکتہ گئے تو وہاں قتیل کے حلقہ بگوشوں سے برسرِ پیکار ہوئے اور اس ایرانی ہندی نزاع میں کود پڑے جو فیضی اور عرفی، اور شیخ علی حزیں اور خان آرزو کے زمانے سے جاری تھی، مرزا نے اس میں بھی سرگرم حصہ لیا اور بعض ایرانیوں سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ پھر ان کی پنشن کا قصہ اُٹھ کھڑا ہوا جس میں تیس برس تک الجھے رہے۔ یہ صرف روپیہ کا معاملہ نہیں تھا، خاندانی حق اور وجاہت کا بھی سوال تھا۔ انھوں نے انگریزوں کی خدمت میں عرضیاں بھیجیں اور حکام کو خوش کرنے کی بیش از بیش کوشش کی لیکن یہاں بھی سوال ثنا گوئی اور مدح گستری سے زیادہ "جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید" کا تھا یا دربار لمبر اور خلعت کا۔

اس وقت وہ تمام روشنیاں جن سے ظلمت کدۂ حیات میں روشنی تھی، ایک ایک کر کے گُل ہو رہی تھیں، وہ تمام قدریں جو مرزا کو بے حد عزیز تھیں ایک ایک کر کے منہدم اور مسمار ہو رہی تھیں لیکن ان کے کلام میں فریاد اور بغاوت پیدا نہیں ہو سکی، اور یہ ادنیٰ بات نہیں ہے۔ اگر گلشنِ ہند کی روایت صحیح ہے تو میر تقی میر کو تین سو روپے ماہوار ملتے رہے، لیکن مرزا غالب کی "ذاتی امارت" ہمیشہ ایک اختلافی مسئلہ رہی اور جب

اس کی قدر و قیمت متعین کرنے کا وقت آیا تو اس کی "مالیت" باسٹھ روپیہ آٹھ آنے سے زیادہ نہ نکلی، اس کے باوجود ان کے کلام میں وہ "کلبیت اور مرثیت" پیدا نہ ہو سکی کہ وہ آہِ جگر گداز اور نالۂ دل خراش کو حاصلِ زندگی سمجھنے لگتے۔

مرزا کی شخصیت میں جو چیز غیر معمولی کشش اور دلآویزی رکھتی ہے وہ ان کی بشریت ہے اور اس پر فخر و ناز ہے۔ ان کے کلام میں عام انسانی مسائل اور الجھنوں کا بیان ہے اور انھیں اس کے اظہار میں مطلق باک نہیں تھا کہ وہ عام انسانی کمزوریوں سے بالاتر نہیں تھے۔ اکرام نے سر والٹر رالے کا ایک قول شیکسپیئر کے متعلق نقل کیا ہے "وہ کمیاب ترین چیز تھا، یعنی ایک پورا انسان"۔ غالب بھی کہتے ہیں:

خوئے آدم دارم، آدم زادہ دارم

سعدی کی طرح ان کی شاعری میں ایک خاص قسم کی ہوش مندی اور دنیاداری ہے جو اس دنیا کے بسنے والوں کو بہت عزیز ہے۔ اس آئینہ میں وہ اپنے ہی خط و خال دیکھتے ہیں اور ان کے دل کی داستان میں ان کو اپنی ہی سرگذشت کا لطف ملتا ہے۔ غالب کی شخصیت صرف پُرشکوہ اور لائقِ احترام ہی نہیں بلکہ وہ ہمارے "ادب کی سب سے خوش صحبت ہستی" ہے، آپ جس رنگ اور لباس میں بھی وہاں جائیں گے وہ آپ کو پہچان لے گی، آپ کے درد دل سے واقف ہوگی اور آپ کی تسکین اور آسودگی کا سامان بہم پہنچائے گی۔ اسی لیے بجنوری نے لکھا تھا کہ لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کون سا نغمہ ہے جو یہاں نہیں ہے۔ اس کی وجہ صرف مرزا کی رنگارنگی اور بوقلموں شخصیت ہے۔

بعض نقادوں نے مرزا کو ولی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض نے شیطان، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ صرف ایک انسان تھا جو بشری کمزوریوں پر پردہ نہیں ڈالتا بلکہ انچہ من نمایم ہستم کا قائل ہے۔

غالب سے پہلے اردو شاعری کے پاس جذبات تھے، احساسات تھے، زبان و بیان کے کرشمے تھے لیکن وہ حسین اور شوخ ذہانت نہیں تھی جو بکھرے الفاظ میں روح پھونک

دینی ہے، یہ مرزا کا عطیہ ہے اور اس پر اُردو جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ وہ اپنے قدیم سرمایے سے واقف تھے لیکن اس کی ہر رسم اور قید کے پابند نہیں تھے، اسی لیے ان کی شاعری افسوں و افسانہ نہیں ہے۔ اس میں نفسِ گرم کی آمیزش ہے، خونِ جگر کی نمو ہے۔ انھوں نے ہمیں نئے نئے خیالات دیئے، ان کے ادا کرنے کا ایک نیا اسلوب دیا اور سوچنے کے لیے حکیمانہ انداز، اور جانچنے کے لیے تنقیدی شعور۔ — اس میں مغل قلم کی شگفتگی ہے، اس کا پُر معنی اختصار ہے، اس کا ترکانہ بانکپن ہے۔ یہ انداز و اسلوب حال اور مستقبل دونوں کے لیے اہم ہے۔ غالب نے غزل اور قصیدے کی خارجی قبا وہی رکھی ہے جو پہلے تھی لیکن ان میں ایک اندرونی انقلاب ضرور پیدا کر دیا ہے۔ ناسخ و نصیر کی دنیا ان تبدیلیوں کی اہمیت کو اچھی طرح نہ سمجھ پائی اور غالب کو یہ کہنا پڑا :

مرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں!

غالب نے نظریۂ حسن و عشق کی تعمیر میں ان کی وراثت، ان کی شخصیت اور ان کے نسل و خاندان کو بڑا دخل ہے۔ وہ محبوب کے وصل کو بہارِ تماشائے گلستانِ حیات سمجھتے ہیں اور بابر کی طرح عیشِ امروز کو "زندگی" کے لیے ضروری۔ انھوں نے جن سچائیوں کا ذکر کیا ہے وہ ذہنی تجرید نہیں بلکہ تجربہ اور جذبے سے بھرپور ہونے کے باعث مجازی، مادی اور انسانی ہیں۔

غالب کی سیرت اور ان کا کردار مثالی نہیں ہے، ان میں بہت سی خامیاں ہیں لیکن یہ خامیاں زیادہ تر ان کے طبقے اور ان کے زمانے کی خامیاں ہیں، تاہم ان کی ذکاوت کا یہ کمال معمولی نہیں ہے کہ وہ اپنے ماحول کی خرابیوں سے باخبر نہیں تھے اور تخریب کے بعد تعمیر ضروری سمجھتے تھے۔ ان کے یہاں جو مغربی تمدن کی برکتوں کا احساس اور انگریزوں کے علم و آئین اور داد و دانش کی تعریف ملتی ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے طبقے اور ماحول سے بلند ہو کر بھی معاملات پر نظر ڈال سکتے تھے۔ غالب نے کلکتہ میں قیام کیا تھا جو اس وقت نئی تہذیب کا گہوارہ تھا۔ آگرہ کے بعد دہلی ان کا وطن تھا جس کو پرانی تہذیب کی علامت کہنا چاہیے لیکن یہاں قدیم دلّی کالج نے سائنسی علوم

کو اہمیت دے کر ایک نئی شمش جہت پیدا کر دی تھی۔ غالب کے ذہن کے نقش و نگار دراصل ان ہی دونوں جگہوں سے مستعار ہیں۔

مرزا غالب نے اُردو شاعری ہی کو نیا رنگ و آہنگ نہیں دیا، جدید اُردو نثر کی بنیاد بھی اپنے بابرکت ہاتھوں سے قائم کی۔ ان کے خطوں میں اُن کی شخصیت اور رنگِ عصر پورے طور پر جلوہ گر ہے۔ وہی شگفتگی، بلند نظری اور تابناکی جو اُن کی شاعری کی خصوصیت ہے، یہاں بھی کارفرما ہے۔ جس طرح ان کی غزل حدیثِ دلبراں سے گذر کر حدیثِ زندگی بن گئی ہے، ایسے ہی ان کے خطوں میں زندگی کا سونا پگھلتا ہوا نظر آتا ہے۔

مرزا اپنا راستہ خود طے کرتے ہیں۔ ان کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ خضر کی بھی پیروی کو وہ غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ بعض وادیوں میں جہاں ان کے پاؤں چلتے چلتے جواب دے گئے ہیں، وہ سینے کے بل راستہ طے کرنا چاہتے ہیں۔ وہ رسم و رواج اور تقلید کے پابند نہیں ہیں، شیخ و برہمن ان کی نظر میں ایک ہیں، ان کے یہاں "اصل چیز عقیدے سے وفاداری ہے، ملتیں اہم نہیں ہیں، ان کے مٹنے سے جو ایمان بنتا ہے وہ اہم ہے۔" ان کی انسانیت کے دائرے میں دیر و حرم اور زنّار و تسبیح کا فرق مٹ جاتا ہے۔ یہی نے خطوں میں بھی ہے " میں تو بنی آدم کو، مسلمان یا ہندو، یا نصرانی، عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔" ان کے دوستوں میں ہندو بھی ہیں مسلمان بھی، کاشانۂ دل کے ماہِ دو ہفتہ، مرزا تفتہ اور نور چشم میر مہدی اور انگریز بھی، جن میں کوئی ان کا امیدگاہ تھا، کوئی دوست، کوئی یار اور کوئی شاگرد۔

مرزا کا زندگی سے واسطہ براہ راست تھا، وہ دو برس کے تھے کہ باپ نے

مرزا کا زندگی سے واسطہ براہ راست تھا۔ وہ دو برس کے تھے کہ باپ نے وفات پائی۔ پانچ سال کے ہوئے تو عمِ بزرگوار نے انتقال کیا۔ اس کے بعد ان کو بے شک عشرت و عیش میسر آیا لیکن اس کی ان کو قیمت بھی ادا کرنی پڑی، قرض خواہوں سے کبھی ان کو رہائی نہیں ملی، زندگی کے بہترین سال انھوں نے جاگیر کی تگ و دو میں گذار دیئے۔ ان کے بھائی مرزا یوسف پاگل ہو گئے، پچاس برس کی عمر میں خود جیل خانے گئے۔ ہزار ارمانوں کے بعد استادِ شہ مقرر ہوئے تو دو ہی سال میں نہ وہ قدح باقی۔ رہا اور نہ وہ ساقی، لیکن" ان

حوادث کو وہ اپنے دریائے بے تابی کی ایک موجِ خوں سمجھ کر برداشت کرتے رہے "
اس کھیل کو انھوں نے بازیچۂ اطفال سمجھا اور اپنی شائستہ ظرافت اور شگفتہ متانت سے
زندگی کو سنبھالا بھی اور سنوارا بھی۔

پریشانیوں اور مصیبتوں میں خود ہنسنا اور دوسرے کو ہنسانا آسان نہیں ہے۔ یہ
بے نیازانہ خوش طبعی اور عالی رواقیت خطوں میں بھی نظر آتی ہے۔ مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں :

"مجھ کو دیکھو، نہ آزاد ہوں نہ مقید، نہ رنجور ہوں نہ تندرست، خوش ہوں نہ ناخوش
نہ مردہ ہوں نہ زندہ، جیے جاتا ہوں، باتیں کیے جاتا ہوں، روٹی روز کھاتا ہوں،
شراب گاہ گاہ پیے جاتا ہوں، جب موت آئے گی، مر رہوں گا، نہ شکر ہے
نہ شکایت، جو تقریر ہے بر سبیلِ حکایت "

مرزا حاتم علی مہر کو تعزیت کا خط لکھتے ہیں۔ کیسا نازک موقع ہے لیکن دیکھیے :

"مرزا صاحب! ہم کو یہ باتیں پسند نہیں، کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ
مرے، کیسی اشک افشانی اور کہاں کی مرثیہ خوانی، آزادی کا شکر بجا لاؤ اور غم
نہ کھاؤ۔ میں جب بہشت کا خیال کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی
اور ایک قصر ملا اور ایک حور ملی، اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک نیک بخت
کے ساتھ زندگانی ہے، اس خیال سے جی گھبراتا ہے، کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ ہے ہے
وہ حور اجیرن ہو جائے گی، طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ
کی ایک شاخ، چشم بد دور، وہی ایک حور، بھائی ہوش میں آؤ، کہیں اور دل لگاؤ "

مرزا غالب کا ایک ایک جملہ خیال انگیز ہے۔ مرقع نگاری میں ان کو کمال حاصل ہے۔ یہ انداز
ظہوری و بیدل یا میر تحسین اور رجب علی بیگ سرور سے مختلف ہے۔

"پانچ لشکر کا حملہ پے بہ پے اس شہر پر ہوا، پہلا باغیوں کا لشکر، اس میں اہلِ شہر
کا اعتبار لٹا، دوسرا لشکر خاکیوں کا، اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و
آسمان و زمین و آثارِ ہستی سراسر لٹ گئے ....."

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں :

"تم نے روپیہ بھی کھویا، اور اپنی نکر اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا، ہائے کیا بُری کاپی ہے اپنے اشعار کی، اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے، صورت ماہِ دو ہفتہ کی سی، اور کپڑے میلے، پائنچے لیر لیر، جوتی ٹوٹی، یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف "سنبلستان" ایک معشوق خوب رو ہے لیکن بدلباس۔"

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

"پہلے تم سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ برابر کئی خطوں میں تم کو غم و اندوہ کو شکوہ گذار پایا ہے، بس اگر کسی بے درد پر دل آیا ہے تو شکایت کی کیا گنجایش ہے، بلکہ یہ غم تو نصیبِ دوستاں درخور افزایش ہے .... اور اگر خدا نہ خواستہ غم دنیا ہے تو بھائی ہمارے ہمدرد ہو، ہم اس بوجھ کو مردانہ اٹھا رہے ہیں، تم بھی اٹھاؤ، اگر مرد ہو۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب نے اس رنج کو مردانہ وار اٹھایا، ان کے یہاں نغمۂ شادی بھی ہے اور نوحۂ غم بھی۔ "ایک فلسفیانہ احساس ہے جس میں رنج و راحت دونوں کی گنجایش ہے" اور شاید دونوں کی آرزو، اُسی نے ان کے بارِ حیات کو ہلکا کر دیا ہے اور یہی ان کا پیغام ہے، اگر غزل گو شاعر کو کوئی پیغام ہو سکتا ہے۔

مرزا غالب کو نظم و نثر دونوں پر قدرت تھی۔ یہ سعادت، یہ بزرگی، یہ عظمت عام نہیں ہے۔ سعدی، ظہوری اور ملٹن کے علاوہ بہت کم لوگوں کو یہ مرتبہ حاصل ہے۔ غالب کے شاعرانہ ابداعات اپنی جگہ بالکل غیر فانی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن اگر خاکم بدہن دیوانِ غالب نہ ہوتا اور صرف خطوطِ غالب ہوتے، تب بھی ان کا مرتبہ اُردو لٹریچر میں وہی ہوتا جو آج ہے۔

غالب اور بے صبر

غالب کے تلامذہ کی فہرست طویل ہے۔ ان کے شاگردوں نے ان کے ساتھ جس محبت اور عقیدت کا ثبوت دیا ہے، وہ اردو کے کم شاعروں کو نصیب ہوئی ہے اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ خود غالب کی شخصیت میں دل نوازی اور محبوبی کی بہت سی خوبیاں موجود تھیں۔

ان کے شاگردوں میں منشی بال مکند بے صبر سکندر آباد ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ سوانح عمری بے صبر میں لکھا ہے کہ وہ مرزا ہرگوپال تفتہ کے بھانجے[1] تھے اور" ۱۸۱۰ء میں بہ مقام سکندر آباد" پیدا ہوئے تھے[2] مالک رام صاحب نے ان کی ولادت کی تاریخ نہیں لکھی۔ البتہ وفات کی تاریخ بغیر حوالے کے ۱۸۹۰ء اور عمر ستر برس لکھی ہے جو صحیح نہیں[3]۔ یہ مضمون "سوانح عمری بے صبر" چونکہ بے صبر کے چھوٹے بیٹے سری برہما سروپ نے اور بے صبر کے انتقال کے فوراً بعد لکھا ہے اس لیے

---

[1] سوانح عمری بے صبر مقالہ پسر خورد بے صبر بحوالہ اردو ادب، ج ۲، ن ۳، ص ۹۴۔
[2] ایضاً
[3] تلامذۂ غالب، ص ۵۵

اہم ہے۔ اس میں لکھا ہے :

"(بےؔصبر نے) بچھتر برس کی عمر میں ۱۳ فروری ۱۸۸۵ء (۱۳۰۳ھ) شیوراتری کو بمقام میرٹھ رحلت فرمائی۔" [1]

مالک رام صاحب کے بیان سے بےؔصبر کی تاریخِ ولادت ۱۸۲۰ء قرار پاتی ہے لیکن موخرالذکر نے اپنی تاریخ ولادت خود نکالی ہے جو اس بیان کے خلاف ہے۔

مرا سالِ ولادت ہندوی میں — جو کوئی صورت و معنی میں پاوے
توکر دے قافیہ کو دور تا ہاتھ — ہزار و ہشت صد شصت و نہہ پاوے [2]
(= ۱۸۶۹ ہندوی)

بےؔصبر کا ترجمہ منشی دیبی پرشاد بشاؔش نے تذکرہ آثار الشعراے ہنود میں دیا ہے :

"بےؔصبر تخلص۔ منشی بال مکند ولد رائے کانہہ سنگھ کایتہ بھٹناگر سکندرآباد ضلع بلندشہر۔ اب عمر قریب ستر برس کے ہے۔ پندرہ برس کے سن سے اب تک شعر کہتے ہیں۔ فارسی اور اُردو میں مرزا غاؔلب کے شاگرد ہیں۔ صاحبِ دیوان اور تصنیفاتِ متعددہ جن کی تفصیل تذکرہ معیار الشعراے ہنود میں کہ جہاں فارسی کلام ان کا درج ہوا ہے، قلم بند ہو چکی ہے ' ۱۷ برس کی عمر سے ۳۷ برس تک مناصب داروغگی و منشی گیری وغیرہ سرکار انگریزی پر مامور رہ کر اب پنشن دار ہیں اور لڑکے نوکر چاکر۔ سوائے علم رسمی فارسی عربی اور کچھ سنسکرت کے جملہ فن شاعری اور علم الٰہی و تاریخ و جغرافیہ و نجوم و منطق و مذاہب سے خیلے واقف ہیں و مذہب خدا پرستی موحدانہ رکھتے ہیں اور ذوؔق، مومؔن، غاؔلب، تفتؔہ اور شیفتؔہ وغیرہ شعراے نامی کے ہم عصر اور ہم مشاعرہ ہیں۔ راقم تذکرہ سے بھی خط و کتابت ہے اور مندرجہ ذیل کلام خود ان کا اس تذکرے کے لیے بھیجا ہوا ہے اور حق یہ ہے کہ ہماری قوم میں غنیمت ہیں

---

[1] سوانح عمری متذکرہ [2] کلیات بےؔصبر قلمی (بشکریۂ عزیزی پروفیسر گوپی چند نارنگ) ورق ۱۳۵ الف

اور قابلِ افتخار ہے"[1]

مالک رام صاحب نے تفتہ سے مشورۂ سخن کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ نہ بشاش کے تذکرے میں ہے اور نہ سری برہما سروپ کی لکھی ہوئی سوانح عمری میں۔ حالاں کہ یہ دونوں بے صبر کو قریب سے جاننے کے مدعی ہیں۔ موخرالذکر نے صرف اتنا لکھا ہے کہ :

"بوجہ موزونیت طبیعت خدا داد اور بہ صحبت مرزا منشی ہرگوپال تفتہ کہ ماموں جناب موصوف کے تھے شوق شعر و سخن دامن گیر ہوا"

حقیقت یہ ہے بے صبر اور تفتہ میں رشتے داری کے علاوہ خواجہ تاشی کی نسبت تھی اور اسی نسبت کا بے صبر نے اپنے کلیات میں ذکر بھی کیا ہے۔ اپنے قصیدہ نمبر ۷ مسمی بہ عقدِ پروین میں جو "مرزا تفتہ صاحب مدظلہ" کی شان میں ہے، فرماتے ہیں :

میں اور وہ دونوں ہیں شاگردِ حضرتِ غالب
یہ خواجہ تاشی کی نسبت ہے درمیاں پیدا[2]

قصیدہ نمبر ۳۶ مسمی قندِ مکرر میں غالب اور تفتہ دونوں کی تعریف کی ہے اور اسی التزام کی وجہ سے اس کا نام "قندِ مکرر" رکھا ہے۔ اس میں گریز کا شعر ہے ؎

غالبِ خوش خیال اور تفتہ شیریں مقال
بخشتے ہیں سخن کو جو عزت و احترام دو

اس کے بعد کہتے ہیں ؎

نثر کے کاروبار کے ہیں یہی دو نو منصرم
نظم کے کارخانے کا کرتے ہیں انصرام دو

قندِ مکرر اس لیے نامِ قصیدہ ہے کہ ہیں
اس میں ثنائے غالب و تفتہ کے التزام دو[3]

بے صبر کو غالب سے بڑی محبت تھی۔ ان کے کلیات میں جا بجا اس قسم کے اشعار ہیں جن سے ان کی والہانہ عقیدت اور ارادت ظاہر ہوتی ہے۔ بارھواں قصیدہ مسمی بہ پرکالۂ آتش

---

[1] تذکرۂ آثار الشعرائے ہنود مرتبہ منشی دیبی پرشاد بشاش خلف تحسن لال بہجت مطبوعہ مطبع رضوی دہلی ستمبر ۱۸۸۵ء ص ۳۲۔ بشاش نے بے صبر کے انتقال کا ذکر نہیں کیا حالانکہ اس تذکرے کی طباعت ستمبر ۱۸۸۵ء میں شروع ہوئی ہے۔ تفتہ فہرست شعرائے تذکرہ مرتب کرتے وقت بھی انھوں نے اصلاح اور صحت کا خاص اہتمام نہیں کیا۔ اس میں بھی یہ جملہ ہے "میرٹھ میں پنشن پاتے ہیں"۔ تکمیلِ طباعت کی تاریخ ۸ جنوری ۱۸۸۶ء مندرج ہے۔

[2] کلیاتِ بے صبر قلمی مستذکرہ۔ ورق ۱۰۰ ب

[3] ایضاً۔ ورق ۱۸۸ ب

"حضرت استاذی مولانا اسد اللہ خاں صاحب غالبؔ" کی مدح میں ہے۔ مطلع ہے ؎

چشمِ بد دور ہے تر دیدۂ گریاں میرا
چادرِ آب کا اک پاٹ ہے داماں میرا[1]

مدح کے اشعار ہیں :

جس کا غالبؔ ہے تخلص، اسد اللہ ہے نام
یہ تو ہے کفر جو کہیے کہ ہے یزداں میرا

پر ہے ہادی مرا، رہبر مرا، استاد مرا
قبلہ ہے، کعبہ ہے، دیں میرا ہے ایماں میرا

مجکو گویا ہے حدیث اس کا جو اردو ہے کلام
فارسی اس کا وہ دیوان، ہے قرآں میرا

انوریؔ ہے وہی، اور وہی مرا خاقانیؔ
آگرہ منہ ہے اور دلّی ہے شرواں میرا

فاریابؔ اس کا ہے گھر، کوچہ ہے اس کا ساوج
ہے ظہیرؔ اپنا وہی اور وہی سلماںؔ میرا

درِ عرفیؔ و شفائیؔ پہ جبیں سا نہیں میں
کعبہ شیراز ہے، نے قبلہ صفاہاں میرا

نام پہ کالۂ آتش ہے قصیدے کا مرے
کہ وہ بے تصبر ہے سوزِ دلِ سوزاں میرا[2]

ایک موقع پر بڑے فخر سے کہتے ہیں ؎

شاعروں پہ کیوں نہ غالبؔ آؤں اے بےؔ تصبر میں
حضرتِ غالبؔ ہیں آخر کو مرے استاد بھی

اس کلیات کا ۲۲ واں قصیدہ بھی مسمّی " دودِ دل" غالبؔ کی مدح میں ہے اور اس طرح شروع ہوتا ہے :

یکتائی جس طرح سے ہے جاناں کو جاں کے ساتھ
ہے یک دلی سخن کو ہماری زباں کے ساتھ

بحرِ رواں سے موج کو ہے جس طرح سے ربط
بحرِ سخن کو ربط ہے طبعِ رواں کے ساتھ

مانندِ لفظ و معنی و مانندِ جسم و جاں
مثلِ صفات و ذات نہاں ہے عیاں کے ساتھ

---

[1] کلیاتِ بے تصبر قلمی ورق ۱۵۹ ب [2] ایضاً ورق ۱۶۰ الف

جب تک پھرے گا چرخ، پھریں گے نہ میرے دن
گردش مرے نصیب کو ہے آسماں کے ساتھ[1]

اس کے بعد لکھتے ہیں ؎

سودا و میر و مصحفی و جرأت اور درد
مجکو نہیں ہے کام کچھ ان رفتگاں کے ساتھ
ممنون و مومن، آتش و ناسخ، نصیر و ذوق
کچھ واسطہ نہیں ہے ان اہلِ زباں کے ساتھ
جو مہر سے ہے ذرّے کو نسبت، وہی مجھے
نسبت ہے میرزا اسداللہ خاں کے ساتھ
غالب ہے غالب الشعرا کا مرے لقب
رشتہ تلامذہ کا ہے اس نکتہ داں کے ساتھ
اس شاہِ ملکِ نظم سے ہے مجکو مشورہ
مثل بزرجمہر ہوں نوشیرواں کے ساتھ
نام آوری وہ کیا ہے جو ہو مدحِ شاہ سے
شہرت ظہیر کو تھی قزل ارسلاں کے ساتھ
معنی نے اس کے شعر اڑائے جہان میں
عنقا یہ وہ ہے اڑتا ہے جو آشیاں کے ساتھ
دعویٰ برابری کا ہے اس کو کمال سے
دلّی کو ہم سری کا ہے سر اصفہاں کے ساتھ
لطف ان کا کون اٹھاوے بغیر از لطیف طبع
لاکھوں لطیفے اس کے ہیں لطفِ زباں کے ساتھ
باوصف کثرت اس کا سخن بھی گراں بہا
ارزاں یہ جنس بکتی ہے نرخِ گراں کے ساتھ

---

[1] کلیاتِ بے تصبر قلمی ورق ۱۰۲ ب

ہنگامِ ذکرِ خندۂ دنداں نمائے دوست
ہے گل فشانی بھی سخن دُرفشاں کے ساتھ
بخت اس کا ہے جوان، و خرد اس کی پیر ہے
پیروں کے ساتھ پیر و جواں ہے جواں کے ساتھ
جام و صراحی و نے و جنگ اس کے (پاس) ہیں
مسرور ہے سدا انھیں خورد و کلاں کے ساتھ
ایراں کو عہدِ غالبِ عالی جناب میں
تابِ مقاومت نہیں، ہندوستاں کے ساتھ
"دودِ دل" اس قصیدہ کا بے صبر نام ہے
سوزِ دروں ہوں مجکو ہے نسبت دخاں کے ساتھ[1]

قصیدۂ اعجازِ سخن میں غالب کی پیروی پر فخر کیا ہے ؎
خوب کی پیروئ حضرتِ غالب شاباش
کہ وہ ملت میں مصدی کے لیے بچہلا مرصل (کذا)
نام بے صبر قصیدے کا ہے "اعجازِ سخن"
اس کا ہر عقدۂ مضمون ہے مالاینحل[2]

اور بعض قصیدے غالب کی زمینوں میں لکھے ہیں۔ کلیاتِ نظمِ غالب میں غالب کا مشہور قصیدہ ہے ؎

خیز تابنگری بہ شاخِ نہال طوطیان زمردیں تمثال[3]

بے صبر نے اسی زمین میں ایک قصیدہ عید کی تہنیت میں "دل فریب" کے عنوان سے لکھا ہے۔ مطلع ہے :

---

[1] کلیاتِ بے صبر قلمی ورق ۱۷۳ ب [2] ایضاً ورق ۱۶۸ ب
[3] کلیاتِ نظمِ غالب : نول کشور ۱۹۲۵ء ص ۲۶۹۔ کلیات بے صبر متذکرہ میں غالب کا یہ شعر اس طرح درج ہے :
خیزہ تابنگری بہ شاخ نہال طوطیان زمردیں پروبال

نسبت ابروے یار سے ہے کمال   عید کا چاند کیوں نہ ہووے ہلال[1]

اسی طرح بعض غزلیں بھی غالب کی زمینوں میں کہی ہیں۔ غالب کی مشہور غزل ہے نمایاں مجھ سے، بیاباں مجھ سے۔ اس میں بے صبر نے غالب کے مصرع پر گرہ لگائی ہے :

شب تنہائی میں بے صبر بہ قولِ غالب   سایۂ خورشید قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے[2]

غالب کی غزل ہے "دیدار ہے، سرشار ہے" اس کا ایک شعر بے صبر نے اپنی غزل کے حاشیے پر لکھا ہے :

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے[3]

اس زمین میں بے صبر نے کیا اچھا شعر کہا ہے ؂

ہر طرف سے اب ترے عاشق کے اوپر وار ہے
تیر برسے تیر، اور تلوار پر تلوار ہے[4]

کلیات بے صبر میں کتابت کی بہت سی غلطیاں ہیں۔ اس میں غالب کا ایک مطلع اس طرح درج ہے ؂

سرگشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے   تسکیں کو دی نوید کہ مرنے کی آس ہے

دیوانِ غالب کے نسخۂ عرشی میں یہ شعر یوں مندرج ہے :

سرگشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے   تسکین کو نوید کہ مرنے کی آس ہے[5]

اس زمین میں بے صبر کی غزل کا مطلع ہے ؂

پاس آئیے ذرا نہ مقامِ ہراس ہے   خدمت میں آپ کی مجھے کچھ التماس ہے[6]

بے صبر نے "بے قراری ہے، کاری ہے" اس زمین میں بھی غالب کی پیروی میں غزل کہی ہے ؂

---

[1] کلیات بے صبر قلمی ورق ۵۵ ب   [2] ایضاً ورق ۱۰۲ الف

[3] ایضاً ورق ۹۰ ب۔ نیز دیوانِ غالب نسخۂ عرشی ص ۲۱۲۔ [4] کلیات بے صبر قلمی ورق ۹۰ ب

[5] نسخۂ عرشی: ص ۲۰۴   [6] کلیات بے صبر قلمی ورق ۹۲ الف

بے قراری سی بے قراری ہے کہ زمیں زلزلہ میں ساری ہے
دجلہ آنکھوں سے میری جاری ہے کوئی طوفاں ہے یا کہ رازی ہے[1]

بے صبر نے غالب کی اس غزل میں بھی شعر کہے ہیں ؎

رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

بے صبر کا مطلع ملاحظہ ہو ؎

جو تجھ بغیر شیشہ و جامِ شراب ہے اپنا دلِ پُر آتش و چشمِ پُر آب ہے[2]

غالب کا مقطع ہے ؎

دلِ نازک پہ اس کے رحم آتا ہے مجھے غالب
نہ کر سرگرم اُس کافر کو اُلفت آزمانے میں

بے صبر نے اس ردیف قافیہ میں بھی غزل کہی ہے۔ یہاں صرف مطلع درج کیا جاتا ہے ؎

دم ناصح ہے بند اک شورِ وحشت ہے زمانے میں
سُنے ہے کون طوطی کی صدا نقّار خانے میں[3]

غالب کی شہرۂ آفاق غزل ہے "دنیا مرے آگے، تماشا مرے آگے"۔ اس کا ایک شعر بے صبر نے حاشیے پر اس طرح درج کیا ہے :

گو ہاتھ میں طاقت نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

مولانا عرشی نے پہلا مصرع اس طرح تحریر فرمایا ہے :

"گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے"

بے صبر کا مطلع ہے ؎

---

[1] کلیات بے صبر متذکرہ ورق ۸۹ ب
[2] ایضاً ورق ۸۸ ب
[3] ایضاً ورق ۶۰ ب

جب منہ سے نقاب اس نے اٹھایا مرے آگے
ایک نور کا عالم نظر آیا مرے آگے[1]

بےؔ صبر نے جرأتؔ کی تقلید میں بھی شعر کہے ہیں ؎

کچھ بن آتی نہیں بےؔ صبر بہ قولِ جرأتؔ
قیدِ عصمت میں ہے وہ، جس کے گرفتار ہیں ہم

جرأتؔ کی غزل پر ایک مسدس کہا ہے ؎

مدت سے شبِ وصل کے ہونے کی خبر تھی
ہر شام سے تا صبح نظر جانبِ در تھی
سو آج وہ شب رشکِ شبِ قدر مگر تھی
لیکن نہیں معلوم گھڑی تھی کہ پہر تھی
کچھ ہم تو نہ سمجھے کہ شبِ وصل کدھر تھی
ٹک زلف سے رخ پر جو نظر کی تو سحر تھی[2]

بےؔ صبر نے غالبؔ کے انتقال کی تاریخیں[3] بھی کہی ہیں ؎

ہماں میرزا غالبؔ استاد من
بجاں آفریں جاں چو آخر سپرد
بہ پرسیدم از دل سن رحلتش
بنالید و گفت آہ غالبؔ بمرد
۱۲۸۵ھ

اُردو کا قطعہ ہے ؎

اسد اللہ خاں وہ غالبؔ آہ	جس سے اہلِ کلام تھے مغلوب
جب سدھارے بسوئے خلد، ہوئے	سخن ان کے الم میں سینہ کوب

---

[1] کلیات بےؔ صبر مع تذکرہ، ورق ۷۳ الف [2] کلیات بےؔ صبر مخطوطہ ورق ۱۲۰ ب
[3] ایضاً۔ ورق ۱۳۶ الف

اس سپہرِ سخن کے اختر کا — مجکو سالِ غروب تھا مطلوب
کہا عیسیٰ نے از سرِ حسرت — ہوا حیف آفتابِ ہند غروب
۱۸۶۹ء

بےتصبر کو یہ "دیوان" بہت عزیز تھا:

شعر سن کر جس کو دیوانہ کہا کرتے تھے آپ
اب وہی بےتصبر دیکھو صاحبِ دیوان ہوا

اس کی وجہ یہ تھی کہ مرزا غالب نے اس دیوان کی (جس کو کلیات کہنا زیادہ صحیح ہے) اصلاح دی تھی ؎

جب حضرتِ غالب نے دی اصلاح اس دیوان کو
بےتصبر کامل ہوگیا اور معتبر میرا سخن

بےتصبر نے اس اصلاح کی تاریخ ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۷ء) درج کی ہے۔

مخطوطۂ کلیات بےتصبر کا یہ تعارف ناتمام رہے گا اگر اس کے پہلے قصیدے "نوبہار" کا ذکر نہ کیا جائے جو ہندوستان کی تعریف میں ہے اور جس کو میرے خیال میں اُردو کی وطنی شاعری میں اولیت کا درجہ حاصل ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اس میں وطن کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ شعرائے ماقبل سے مختلف اور نیا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ یہ "دیوان" ۱۸۵۷ء میں اصلاح پاکر مرتب ہوگیا تھا ؎

ورق ۱۳۷ الف:

خطۂ دل نشیں ہے ہندوستاں — خاک روئے زمیں ہے ہندوستاں
دل نشیں کیوں سواد ہے اس کا — گر سویدا نہیں ہے ہندوستاں
دو طرف بحر و یک طرف ہے سندھ — یک طرف تا بہ چیں ہے ہندوستاں
مرد و زن یہاں کے حور و غلماں ہیں — رشکِ خلدِ بریں ہے ہندوستاں
یہاں کے عارف جہاں میں ہیں معروف — مجمع العارفیں ہے ہندوستاں

.... ورق ۱۳۸ الف:

پہلوان و حکیم و عارف سے — کبھی خالی نہیں ہے ہندوستاں

ہے تواریخِ ہند سے ظاہر — کہ بہت اولیں ہے ہندوستاں
یہیں برہما تھا جدِ ہر دو جہاں — دو جہاں آفریں ہے ہندوستاں
جہاں دیکھو وہاں ہے باغ و بہار — پُر گل و یاسمیں ہے ہندوستاں
کہتے ہیں گُل زمین کے سیاح — کہ عجب گل زمیں ہے ہندوستاں
مردمِ چشمِ حُسن ہیں ہندی — خط روئے حسیں ہے ہندوستاں

.... ورق ۱۳۸ ب :

ناز اس کا نہ کیوں نیاز اُٹھائے — شاہدِ نازنیں ہے ہندوستاں
پائے تمکیں کو دستِ بخشش کو — دامن و آستیں ہے ہندوستاں
حق ابد تک رکھے اسے آباد — کہ ازل سے گزیں ہے ہندوستاں

.... ورق ۱۳۹ الف :

حق اسے سنگ تفرقہ سے بچائے — کہ سبک آبگیں ہے ہندوستاں
نوبہار اس قصیدہ کا ہے نام — کیونکہ اس کی زمیں ہے ہندوستاں

غالب اور آزردہ

مفتی صدرالدین خاں آزردہ دہلوی کا پایہ علم وفضل اور نجابت وشرافت میں بہت بلند ہے۔ وہ مولانا فضل امام خیرآبادی اور حضرت شاہ عبدالقادر کے شاگرد تھے اور مولوی فضل حق کے ہم سبق۔ حضرت شاہ عبدالعزیز نے ایک فارسی خط میں جو انھوں نے کلکتے کے مولانا امین اللہ کے نام لکھا تھا، ان کا شمار دہلی کے "فضلائے نامدار" میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ "فنون عقلی ونقلی اور ادب واصول میں مہارتِ تام رکھتے ہیں۔"

تذکرہ کریم الدین میں لکھا ہے :

"آزردہ ...... گنجینۂ علم وکان حلم وبحرِ سخا، مخزنِ لطف وجود وعطا، لبیدِ دوراں، حسانِ ہندوستان، عالمِ کامل، فاضلِ اجل، فقیہہِ بے مثل، عالم باعمل، مدح میں ان کی جو لکھوں سو کم ہے، کیوں کہ وہ ایسا ہی عالم ہے ...... ہر چند کہ مناسب نہیں کہ اس تذکرۂ شعرائے اُردو میں جو کہ ان کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتا ان کا نام لکھوں، مگر اتنا میں جانتا ہوں کہ بدوں نامِ نامی ان کے کی یہ کتاب رونق نہ پاوے گی اور پسندِ احباب

نہ ہوگی کیوں کہ اس زمانہ کے شعرا اُردو گویوں میں مثل شاہنشاہ کے ہیں[1]"۔

مولوی بشیر الدین احمد دہلوی نے لکھا ہے :

"(آزردہ) ایسے مستجمع اوصاف حمیدہ اور خصائلِ برگزیدہ کے تھے کہ آج کا نام نیک اور شہرۂ معدلت ضرب المثل ہے..... بے شائبۂ تکلف و بے آمیزش ایسا فاضل اور ایسا کامل سوائے سرگروہ علماء کے بساطِ عالم پر جلوہ گر نہ تھا[2]"

مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ آزردہ کے دیوان خانے میں اہلِ علم کا مجمع رہتا تھا اور اس کی حیثیت ایک اکیڈمی کی سی تھی۔ ان کا مذاقِ سخن بہت پاک تھا۔ افسوس ہے کہ ان کا نہ تو دیوان ملتا ہے اور نہ تذکرۂ شعرائے ریختہ۔ لیکن حالی نے جو اقوال اُن سے منسوب کیے ہیں ان سے ان کی نکتہ سنجی اور سخن فہمی کا پورا ثبوت ملتا ہے۔

یہ اشعار ایک اعلیٰ درجے کا شاعر ہی کہہ سکتا ہے ؎

یہ کم نگاہیاں تری بزمِ شراب میں   میں اور ذوقِ بادہ کشی لے گئیں مجھے

کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے   کامل اس فرقۂ زہاد میں اُٹھا نہ کوئی

کیا خاک جیے کوئی، شب ایسی، سحر ایسی   مکھڑا وہ غضب زلفِ سیاہ فام یہ کافر

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں   اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں
ملنا ترا یہ غیر سے ہو بہرِ مصلحت   ہم کو تو سادگی سے تری یہ گماں نہیں
اچھا ہوا نکل گئی آہِ حزیں کے ساتھ   اک قہر تھی، بلا تھی، قیامت تھی، جاں نہیں
کٹتی کسی طرح سے نہیں یہ شبِ فراق   شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں

---

[1] تذکرہ کریم الدین، ص ۴۴۶، اس کے علاوہ ملاحظہ ہو سخن شعرا (نولکشور) از نساخ، ص ۲۲۔
[2] واقعات دار الحکومت دہلی، ج ۲، ص ۱۴۸ (شمسی مشین پریس، آگرہ)۔

افسردہ دل نہ ہو درِ رحمت نہیں ہے بند | کس دن کھلا ہوا درِ پیرِ مغاں نہیں
آزردہ نے پڑھی غزل اک مے کدے میں کل | وہ صاف ترکہ سینۂ پیرِ مغاں نہیں

دامن اس کا تو بھلا دور ہے ہاں دستِ جنوں | کیوں ہے بیکار گریباں تو مرا دور نہیں

گھر سے گھبرا کے، کھلے بالوں، ہر اک کھٹکے پر | کیوں نکل آتے ہو دھوکے میں جو بیتاب نہیں

اسی کی سی کہنے لگی اہل حشر | کہیں پرسشِ داد خواہاں نہیں

غالب نے اس قطعہ میں ان کی سخن وری کا اعتراف کیا ہے ؎

ہند را خوش نفسا نند سخن ور کہ بود | باد در خلوتِ شاں مشک فشاں از دمِ شاں
مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ | حسرتی، اشرف و آزردہ بود اعظم شاں

غالب نے شیفتہ کو ایک مشاعرے کی شرکت کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں رنج راہ کی تلافی، مخدومِ معظم و صدر اعظم مولوی محمد صدرالدین خاں بہادر کے دیدار سے ہوگئی[1] شیفتہ ہی کو ایک اور مشاعرے کا حال لکھتے ہیں کہ حضرت آزردہ اگرچہ دیر میں آئے لیکن انھوں نے آکر دل کو صفا اور زبان کو نوا بخشی اور میں نے گریستن کی زمین میں اپنا فارسی قصیدہ پڑھا۔ حالی کا بیان ہے کہ یہ قصیدہ بہت کامیاب رہا۔

شیفتہ نے گلشن بے خار کے مسودے میں آزردہ کا ترجمہ شامل نہیں کیا تھا اس کو دیکھ کر غالب نے شیفتہ کو لکھا ہے:

"گہر نہ سفتنِ خامہ ...... در ردیف الف بنگارش اشعار پرویں شعار حضرت آزردہ از چہ است، ہر چہ ذکرِ خدام بر جبیں مقام در جریدۂ ایں فن نہ سزاوارِ شان فضیلت باشد، لیکن اگر بہ مقتضائے فرطِ محبت

---

[1] پنج آہنگ، ص ۲۰۱۔ [2] ایضاً، ص ۲۰۲۔

جرأتے بکارمی رفت گناہے نبود، و در تلافیِ آں بہ پوزشِ نیاز نمی افتاد[1]"
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیفتہ نے آزردہ کا حال بڑھا کر یہ کمی پوری کر دی۔ اس کے چند جملے ملاحظہ ہوں :

"دعویٔ ادراک علمش از جہل خیاط ازل بایں خوبی قبائے قابلیت بہ بالائے ندوختہ و روشن گر قضا بایں روشن دلی و آگاہی آئینہ ضمیرے نیفروختہ، بایں فضیلتِ شاعری از ایران سر نکشیدہ و بایں عظمت ساحری از بابل نرسیدہ، باخیال شرحِ کمالاتش طوطیٔ خامہ من بایں قدرت گفتار نغمہ سنج بے زبانی است[2]"

غالب نے آزردہ کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھا ہے جو کلیات فارسی میں موجود ہے۔ چند اشعار یہ ہیں ؎

زاں نمی ترسم کہ گردد قعرِ دوزخ جائے من ۔۔۔ وائے گر باشد ہمیں امروزِ من فردائے من
صدرِ دین و دولت و صدر الصدورِ روزگار ۔۔۔ میر و مخدوم و مطاع و والی و موائے من
گویم داز نکتہ چیناں در دلم نبود ہراس ۔۔۔ کیقباد و قیصر و کیخسرو و دارائے من
موکبش چوں مرجعِ عام ست با غیرم چہ بحث ۔۔۔ پر شسے دارد ارسطو میدود ہمپائے من
عاجزم چوں در ثنائے دوست بار شکم چہ کار ۔۔۔ میردم از خویشتن تا گیر دعطا دجائے من

خاک کویش خود پسند افتاد در جذبِ سجود
سجدہ از بہرِ حرم نگزاشت در سیمائے من[3]

غدر کے الزام میں مولوی فضل حق انڈمان بھیجے گئے۔ شیفتہ کو سات برس کی قید ہوئی۔ آزردہ کو بھی قید و بند کے مصائب جھیلنا پڑے، غالب نے ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں لکھا ہے :

---

[1] کلیات نثرِ غالب، پنج آہنگ طبع ۱۸۴۳ء خط بنام شیفتہ
[2] تذکرۂ گلشنِ بے خار (شیفتہ) نول کشور، ص ۱۱
[3] کلیات فارسی ص ۳۲۰ تا ص ۳۲۲

"حضرت مولوی صدرالدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا، روبکاریاں ہوئیں، آخر صاحبان کورٹ نے جان بخشی کا حکم دیا، نوکری موقوف، جائداد ضبط، ناچار خستہ و تباہ حال لاہور گئے، فنانشل کمشنر اور لفٹنٹ گورنر نے از راہ ترحم نصف جائداد واگذاشت کی۔ اب نصف جائداد پر قابض ہیں، اپنی حویلی میں رہتے ہیں، اگرچہ یہ امداد ان کے گزارے کو کافی ہے؛ اس واسطے کہ ایک آپ اور ایک بی بی، تیس چالیس روپے مہینے کی آمدنی، لیکن امام بخش کی اولاد ان کی عترت ہے اور وہ دس بارہ آدمی ہیں، فراغ بالی سے نہیں گزرتی، ضعف پیری نے بہت گھیر لیا ہے۔ عشرۂ ثانیہ کے اواخر میں ہیں، خدا سلامت رکھے بہت غنیمت ہیں"

مجروح کو لکھتے ہیں:

"دلّی کہاں؟ ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا.... اہلِ اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں، میرٹھ میں مصطفیٰ خاں، سلطان جی میں مولوی صدرالدین، بلی ماروں میں سگِ دنیا موسوم بہ اسد، تینوں مردود مطرود محروم و مغموم" خطوط غالب، ص ۲۵۸۔

آزردہ کا انتقال ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ ہجری (یعنی ۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء) کو ہوا۔ شمس الشعرا مولوی ظہور علی نے تاریخ وفات لکھی ہے

چو مولانائے صدر الدین در عصر ۔۔۔ امام اعظمِ آخر زماں بود
زہے صدر الصدور نیک محضر ۔۔۔ بعدل و داد چوں نوشیرواں بود
بروز پنجشنبہ کرد رحلت ۔۔۔ کہ ایں عالم نہ جائے جاوداں بود
ربیع الاول و بست و چہارم ۔۔۔ وداع رو سوئے دار الجناں بود
چراغش بست تا تاریخِ ولادت
کنوں گفتم چراغ دو جہاں بود[1]

---

[1] تذکرۂ علمائے ہند، ص ۵۴

(۲)

آزردہ نے انتقال سے ایک دن پہلے نواب کلب علی خاں والیِ رام پور کو ایک خط لکھا ہے جو نہایت اہم اور غیر مطبوعہ ہے۔ اس لیے ہم اسے تمام وکمال نقل کرتے ہیں:

جناب مستطاب نواب صاحب معلی القاب جم المناصب کثیر المناقب معدن تفقد و نوازشِ بے پایاں، استظہار نیازمنداں، ملاذ عقیدت کیشاں دامت عنایتکم۔

شکرِ الطاف والا میری طاقت سے افزوں ہے۔ حق یہ ہے کہ آپ نے میری آخری عمر میں مجھ سے ایسا سلوک کیا کہ اس کا عوض سوائے خداوند کریم کے بشر سے ہونا جملہ محالات سے ہے۔ اللہ کریم آپ کو اپنی بارگاہِ والا جاہ سے دین اور دنیا میں مدارج علیا عطا فرمائے۔ میں ایک عرصۂ دراز سے مرضِ فالج میں مبتلا تھا۔ جناب جناب پر بھی تمام کیفیت روشن ہے۔ اب چند روز سے تپ اس شدت سے ہوئی ہے کہ مجھ کو زندگی سے یاس ہے۔ ایک میری زوجہ[1] ضعیفہ اور دوسرا خواہر زادہ محمد احسان الرحمٰن خاں نام جس کو میں نے فرزندانہ پرورش کیا ہے اور نہایت لئیق اور سعادت مند اور نیک چلن ہے، ان دونوں کو آپ کی سپرد کیے جاتا ہوں، اگر ناگوارِ خاطرِ عاطر نہ ہو تو میرے بعد ان کی خبر گیری کسی قدر فرماتے رہیں۔ یہ ایک نوع کا حسنِ سلوک میرے بعد بھی مجھ سے ہوگا ؎

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم و بیش را

شاید یہ میرا آخری خط ہے۔ ذوالجلال والاکرام آپ کو عمرِ خضری اور دانشِ فلاطونی اور اقبالِ سکندری عطا فرمائے۔

---

[1] لاڈو بیگم نام تھا۔ رام پور میں نواب صاحب کے نام لاڈو بیگم کی عرضی بھی فارسی میں ہے، جس میں انھوں نے آزردہ کے کتب خانے کی فہرست بھیجی ہے اور لکھا ہے کہ انھوں نے ان کتابوں کو غدر کے بعد فراہم کیا ہے۔

معروضہ پانزدہم جولائی ۱۸۶۸ء مطابق بست وسوم ربیع الاول ۱۲۸۵ھ

نیاز نامہ محمد صدر الدین خاں صدر الصدور سابق دہلی[1]

پتہ پر لکھا ہے:

بسیار ضرورت زود تر برسد   مہر   محمد صدر الدین خاں

طرفہ لطیفہ ہے کہ غالب نے آزردہ کے انتقال کے بعد جن سے زندگی بھر ان کے بڑے اچھے مراسم رہے اور جن کو انھوں نے میر و مخدوم و مطاع اور والی و مولا سب ہی کچھ کہا تھا، نواب کلب علی خاں کو ایک خط لکھا ہے جس میں مرحوم دوست کی بیوہ کے کام میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی ہے اور ان کی ضرورت کو غیر اہم ثابت کر کے اپنا کام نکالنا چاہا ہے۔ غالب کی سیرت کا یہ پہلو قابلِ اعتراض ہی نہیں عبرت انگیز بھی ہے۔ ہم وہ غیر مطبوعہ خط بجنسہ نقل کرتے ہیں:

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے آج شہر میں شہرت ہے کہ حضرت امیر المسلمین نے مفتی صدر الدین مرحوم کی زوجہ کو پانسو روپے مفتی جی کی تجہیز و تکفین کے واسطے رام پور سے بھیجے ہیں۔ فقیر کو بھی توقع پڑی کہ میرا مُردہ بے گور و کفن نہ رہے گا جیسا کہ میرزا جلال اسیر کہتا ہے:

ع   جرعۂ لطف تو بعد از ما بما خواہد رسید

میں نے کل ایک خط نواب مرزا خاں کو لکھا ہے۔ خدا جانے وہ حضرت کی نظر سے گزرے یا نہ گزرے۔ اس خط میں میں نے زوجۂ مفتی جی کا حال یہ لکھا ہے کہ وہ لاولد ہے اور ساٹھ روپے کرایہ کے مکان اس کے تحت میں ہیں۔ امین[2] الرحمٰن اس کا بھانجا ہے، مفتی جی کا کوئی نہیں۔

اب اپنی حقیقت عرض کرتا ہوں۔ آخر عمر میں تین التماسیں ہے (کذا)

---

[1] دارالانشا سرکار دولتمدار رام پور، مثل نمبر ۲۵۶، صیغۂ دوست آشنایان۔ اس کے بعد دو سو روپے لاڈو بیگم کے مقرر کر دیئے گئے۔

[2] آزردہ نے احسان الرحمٰن لکھا ہے۔

آپ سے، ایک تو یہ کہ میں ہزار بارہ سو روپے کا قرض رکھتا ہوں، چاہتا
ہوں کہ میری زندگی میں ادا ہو جائے، دوسرا التماس یہ کہ حسین علی خاں
کی شادی آپ کی بخششِ خاص سے ہو جائے اور یہ سو روپے مہینا جو
مجھے ملتا ہے اس کے نام پر اس کے حینِ حیات قرار پائے، یہ دو خواہشیں
خواہ میری زندگی میں، خواہ میرے بعد اجرا پائیں ؎

تم سلامت رہو قیامت تک   دولت و عز و جاہ روز افزوں

روز شنبہ ۵ ربیع الثانی ۲۷ جولائی سال حال، عرضداشت دولت خواہ اسد اللہ

(لفافہ پر ۲۷ جولائی ۱۸۶۸ء درج ہے)

یہ خط مکاتیبِ غالب میں نہیں ہے، لیکن اس تاریخ کے بعد کا پہلا خط مندرجہ ذیل
ہے۔ دونوں میں تعلق ہے، اس لیے اس کے چند جملے نقل کیے جاتے ہیں:

تین التماسیں سابق (میں) پیش ہوئی تھیں، سو اب پہلے برخوردار نواب
مرزا خاں کی تحریر سے، اور پھر جناب مظفر حسین خاں بہادر کے خط سے
ان خواہشوں کے منظور و قبول ہونے کی نوید پائی۔ انشا اللہ الکریم
حسب ارشادِ حضور اسی برس ۶۸ میں آمد زمستاں یعنی نومبر و دسمبر میں میرا
قرض بھی ادا ہو جائے گا اور حسین علی خاں کی شادی بھی ہو جائے گی اور
اس کے واسطے اس کی زندگی تک تنخواہ جداگانہ مقرر ہو جائے گی۔

باکریماں کارہا دشوار نیست[2]   معروضہ ۱۲ ماہ اگست ۱۸۶۸ء

غالبؔ نے نوابانِ رام پور کو خاصے خوشامدانہ خط لکھے ہیں لیکن بندگی میں بھلا نہ ہونا
عبد اور معبود دونوں ہی کے لیے شرمناک ہے اس لیے غالبؔ کا جرم بڑا ضرور ہے لیکن
اتنا بڑا نہیں جتنا سمجھا جاتا ہے، انھوں نے انگریز حکام کی تعریف میں بھی کوئی کسر نہیں
اٹھا رکھی۔ ان کی خود نوشت کے یہ الفاظ ان کے نہاں خانۂ دل کے بہت سے اسرار

---

[1] دار الانشا سرکار دولت مدار رام پور، مثل نمبر ۲۳۳ صیغۂ دوست آشنایاں

[2] مکاتیب غالب (مرتبۂ عرشی) ص ۸۱، ۸۲

ہمارے اوپر ظاہر کر دیتے ہیں :

"گورنمنٹ میں اس کی (غالب کی) بڑی عزت ہے۔ اشرفیوں کے عوض قصیدہ مدح نذر دیتا ہے۔ اب کی بار جو لارڈ صاحب کا دربار ہوا تو موافق کے دربارداروں کی فہرست کے صاحب کمشنر بہادر حصار نے کہ دریں ولا قائم مقام صاحب کمشنر دہلی بھی ہیں، مثل اور رئیسوں کے اور رئیس زادوں کے اس کو بھی خط لکھا، بے چارہ بسبب تہی دستی اور بے مقدوری کے لاہور نہ جا سکا۔ مجھ سے کہتا تھا کہ ستر برس کا آدمی، کانوں سے بہرا ہوں اور اکثر بیمار رہتا ہوں لیکن اگر میرے پاس روپیہ ہوتا تو میں ان عوارض کو نہ مانتا اور بے شک لارڈ صاحب کے دربار میں حاضر ہوتا۔ خیر آخر عمر میں یہ ایک داغ حسرت رہا۔ حق بات کو ظاہر نہ کرنا خدا پرستی اور حق شناسی کے خلاف ہے۔ اس شخص نے ۱۸۵۵ء کے آخر میں قصیدہ مدح ملکہ معظمہ ولایت کو بسبیل ڈاک لارڈ ڈالن برا گورنر سابق کی معرفت بھیجا ہے اور اوائل ۱۸۵۶ء میں تین خط انگریزی بے واسطۂ انڈیا گورنمنٹ ولایت سے اس کو ڈاک میں آئے ہیں۔[1]

ان امور میں زیادہ سے زیادہ اس زمانے کے مخصوص حالات اور غالب کی نجی دقتوں کی آڑ لی جا سکتی ہے لیکن ان کا جو معاملہ بعض معاصرین اور خاص طور پر آزردہ کے ساتھ رہا ہے وہ صریحاً اتنا قابلِ اعتراض ہے کہ اس کے لیے کوئی وجہ جواز ڈھونڈھنا مشکل ہے۔ غالب کی عظمت صرف ان کی تخلیقات میں نظر آتی ہے جہاں وہ اپنے طبقے اور سماج کی خرابیوں سے بلند ہو کر اپنی سحر کار آواز سے سب کو متوجہ کر لیتے ہیں۔

---

[1] مرزا غالب کی خود نوشت سوانح عمری کا ایک ورق (مخطوطہ) : اُردو ۱۹۳۰ء، ص ۲۲۸

غالب کی شخصیت اور شاعری

میں

ترکی، ایرانی عناصر

انیس سو انہتر (۱۹۶۹) کے متعلق:

اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

ہندوستان ہی کی تاریخ میں نہیں، بلکہ نوعِ انسانی کی تاریخ میں۔ اس سال آدمِ خاکی کو وہ عروج حاصل ہوا کہ افلاک اس کی ہمت کے آگے سرنگوں ہو گئے، ستارے کانپ اُٹھے، چاند سہم گیا۔ انسان کے سفیر، جہانِ قمر میں پہنچ گئے اور انسان نے اس کرۂ ارض کو، جس پر ہم رہتے ہیں، پہلی دفعہ زمین سے ہٹ کر بطور اکائی کے دیکھا اور یہ محسوس کیا کہ ہماری فلاح اور ترقی کا راز صرف یہ ہے کہ ہم اپنے کو بڑی وحدت کا جزو سمجھیں۔ اسی کے ساتھ اس کو یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ زمین جس پر ہم رہتے ہیں، نظامِ شمسی کے کروڑوں چھوٹے چھوٹے سیاروں میں سے ایک ہے اور فضائے بسیط میں اس کی حیثیت ایک ذرّے سے زیادہ نہیں۔ یہ علم جو اس کو حاصل ہوا، وہ اس کا

عشر عشیر بھی نہیں جو ابھی اس کو حاصل کرنا ہے۔ اس طرح انسان کو پہلی دفعہ اس کا یقین ہوا کہ نوعِ انسانی کے ارتقا میں انسانی ذہن بھی برابر کا شریک ہے۔ وہ عالمِ طبعی سے علیحدہ نہیں، بلکہ اس کا باشعور اور غیر مغلوب حصہ ہے اور انسان اپنی بے پناہ ذہنی، اخلاقی اور جمالیاتی صلاحیتوں کو اُبھار کر اور نئے معانی کی تخلیق کر کے بلند تر اور برتر سعی و عمل کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ انسان کی ترقی میں سب سے اہم حصہ خود اس کے ذہن اور فکر کا ہے۔ لیکن طوفِ قمر داغِ جگر بھی تو ہے اور اس کا درماں اگر ہے تو صرف دانشوروں، عارفوں، فنکاروں اور شاعروں کے پاس ہے۔ اس لیے کہ ٹکنالوجی ہزار ترقی کر لے، وہ اقدار کی محرم اور زندگی کے سوز و ساز کی شریک نہیں ہو سکتی۔ وجدان اور فکر کے یہ معجزے ہماری تہذیب کی ابدی دولت ہیں اور ان کے تسلسل ہی پر ہماری ترقی کا انحصار ہے۔ ان کی تخلیق میں دانشور کی فکرِ بیدار، شاعر کا ذہنِ رسا، عارف کا وجدانِ صحیح اور صوفی کا قلبِ گداز سب ہی شامل ہیں۔ اور ان ہی کے ذریعے زندگی کا قافلہ آگے بڑھتا ہے اور ماضی، حال اور مستقبل میں نئی معنویت پیدا ہوتی ہے۔ انسان کی ترقی کی بنیاد یہی تہذیبی تسلسل ہے جو ترکیب و امتزاج کے ذریعے اور مجموعی تہذیب کی شکل میں ہم کو عہد بہ عہد، اور نسلاً بعد نسلٍ ملتا رہتا ہے اور جس کے ذریعے ہم ہر نئی نسل کو حسن و معنی کی ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

اس اعتبار سے میں مرزا غالب کی یاد منانے کو ہوں۔

اس لیے کہ ذہن کی تربیت تہذیبی ورثے سے ہوتی ہے اور دل و دماغ کی سیرابی میں ان ادبی کارناموں کی بڑی اہمیت ہے۔ ہندوستان تہذیبی دولت سے مالا مال ہے لیکن اس تونگری میں غالب کی تخلیقات نے مزید اضافہ کیا ہے۔ ہندوستان کی کئی ہزار سال کی تہذیبی تاریخ، حیرت انگیز کارناموں سے مملو ہے۔ اس نے دنیا کی تہذیب کے نقش میں اپنی شوخیِ تحریر سے رنگ بھرا ہے اور اس کے مرقع کو پہلے سے زیادہ اونچی محراب پر سجایا ہے۔ مثال کے طور پر عہدِ قدیم کی مقدس کتابیں، مہاتما بدھ کی

تعلیمات، اشوک اور اکبر کے کارنامے، کالی داس کی شکنتلا، سانچی کے آثار، اجنتا کے نقوش، جنوبی ہند کی بُت تراشی، اُڑیسہ کے مندر، آگرہ کا تاج محل، فتحپور سیکری کے محلات، دہلی کی مساجد اور قطب مینار، حضرت نظام الدین اولیا، کبیر اور نانک کا تصوّف، اُردو کا آغاز و ارتقا، میرابائی کے گیت، میر کی غزلیں، مندروں کے رقص، مغلوں کے حکمت آمیز قصّے، منصور اور منوہر کی رنگ کاری، بیجو اور تان سین کی نغمہ سرائی، خسرو اور غالب کی شاعری نے فنونِ لطیفہ کو ان جمالیاتی بلندیوں تک پہنچا دیا ہے جس پر خود تاریخ کو رشک ہے۔ اس فنِ تعمیر، اِس سنگ تراشی، اس مصوری، اس رقص، اِس شیوہ بیانی کے پیچھے آخر وہ کون سی مضطرب آرزو ہے جس نے ان فنی تخلیقات کو دوام بخشا ہے، وہ کون سا روشن ذہن کارفرما ہے جو برابر موت کی حقیقت سے انکار کرتا رہا اور یہی کہتا رہا :

مرگ ، اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

ہندوستان ایک عظیم الشان تہذیب کا وارث ہے اور اس باغ کی شادابی اور خوش نمائی اس میں پوشیدہ ہے کہ اس میں صرف ایک رنگ یا ایک قسم کے پھول نہیں ہیں بلکہ بہت سے رنگوں کے اور بہت سی قسموں کے پھول ہیں، اور ان سب کی شادابی پر ہمارے باغ کی شادابی اور خوش نمائی کا انحصار ہے۔ تہذیب کا وہ سرچشمہ جو موہنجدارو سے بھی پہلے پھوٹا تھا، عہدِ قدیم، عہدِ وسطیٰ اور عہدِ جدید کے میدانوں سے گزرتا ہوا ہم تک پہنچا ہے اور ان مختلف تہذیبی نہروں نے ہمارے باغ کو اتنا سرسبز و شاداب بنا دیا ہے کہ باوجود ہزاروں ماہ و سال گزرنے کے اس پر کسی قسم کی کملاہٹ کا اثر نہیں۔ یہاں مختلف قومیں اور تہذیبیں آئیں۔ ان میں آویزش بھی ہوئی اور آمیزش بھی۔ لیکن ان موجوں نے اس تہذیب کی مٹی کو پہلے سے زیادہ زرخیز بنا دیا اور اس تمدن میں وہ رنگا رنگی، وہ خوب صورتی، وہ گہرائی، وہ گیرائی پیدا کر دی جو ہمارا ہی نہیں، نوعِ انسانی کا بیش قیمت ورثہ ہے۔

ہندوستانی تہذیب میں جو بنیادی عنصر کارفرما ہے، وہ کثرت میں وحدت اور مظاہر کی رنگا رنگی میں، اصل حقیقت اور ماہیت کی جستجو ہے۔ اکبر کہا کرتا تھا کہ نقاشی کے ذریعے مجھے عرفانِ الٰہی کی ایک مخصوص انداز میں آگہی حاصل ہوتی ہے۔ غالب نے پتھروں میں رقصِ بتانِ آزری کا نظارہ کیا ہے۔

غالب کی شاعری میں بھی انھی بنیادی تصورات اور اسی جمالیاتی شعور کی کارفرمائی ہے۔ غالب کی شخصیت کا تار و پود ترکی، ایرانی اور ہندی عناصر سے مل کر بنا ہے اور ان کے ذہن کے تمام نقش و نگار، ان کی طبیعت اور مزاج کے علاوہ ان کی طبیعی اور معاشی ماحول اور تمدنی اور تہذیبی ورثے نے مل کر ترتیب دیے ہیں۔ یہی وہ تشکیلی اثرات ہیں جنھوں نے ان کی جمالیاتی اقدار کی صورت گری کی ہے اور جو میرے اس لکچر کا موضوع ہیں۔ اس لیے کہ اگر ہم غالب کے افکار کی نفسیات کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان تہذیبی عوامل کی نشاندہی کرنا ہوگی جو صدیوں اور نسلوں سے گزر کر اور چھن کر ان کی شخصیت اور شاعری میں تہ نشین ہو گئے تھے جنھوں نے ان کو قدروں اور معیاروں کا ایک ہم آہنگ تصور بخشا اور جن کی بدولت ان کی شخصیت میں دلکشی اور شاعری میں توانائی اور تازگی پیدا ہو گئی۔

ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ انسان، فطرت سے ہم آہنگی یا کشمکش کے ذریعے جو تجربات حاصل کرتا ہے، تہذیب اسی کی مرتب شکل ہے۔ رازِ فطرت کی تلاش و جستجو اور فطرت کے خلاف جد و جہد، تہذیب کے سفر کا زاد راہ ہیں۔ کسی خاص تہذیب کے انداز کا انحصار، انسان کی طبیعت اور مزاج کے علاوہ اس کے ماحول کی نوعیت اور ان کے باہمی عمل اور ردِ عمل پر بھی ہوتا ہے۔ اس طرح سوچیے تو معلوم ہوگا کہ غالب کی شخصیت اور شاعری کو ہند، ایرانی، ترکی تاریخ کے پس منظر ہی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ ان کے اجتماعی ورثے، ان کے ملکی ماحول اور ان کی شخصی افتادِ مزاج نے باہم مل کر ہی ان کے ذہن کے نقش و نگار ترتیب دیے ہیں۔

غالب کے اجداد وسط ایشیا کے رہنے والے تھے اور یہ وہ علاقہ ہے جہاں آریائی تہذیب کی پہلی کرن پھوٹی۔ اس جغرافیائی علاقے کی حد بندی قدرت نے کچھ اس طرح کی

ہے کہ ایک طرف کوہستان الطائی ہے، دوسری طرف بحرِ کیسپین۔ نیچے پامیر اور قراقرم کے پہاڑ۔ مشرق میں گوبی کا ریگستان اور مغرب میں آمو۔ سردریا اور زرافشاں کے چھوٹے چھوٹے نخلستان بھی وہ خطہ ہے جو تہذیب کا گہوارہ کہلاتا ہے۔ ماہرینِ ارضیات کا خیال ہے کہ یہ علاقہ ایک زمانے میں جھیلوں اور آبشاروں سے بھرا ہوا تھا لیکن آب و ہوا کی تبدیلی سے خشک ہونا شروع ہوا اور رفتہ رفتہ سیکڑوں بستیاں ریت میں دھنس گئیں۔ بارش کی قلت اور فقدانِ راحت سے مجبور ہو کر ترکستان کے رہنے والے ہجرت پر مجبور ہوئے اور یہ سلسلہ غالب کے انتقال سے ایک سال پہلے تک اسی شدت سے جاری رہا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۸۶۸ء میں ۸۰،۰۰۰ ترک، غالب کی زبان میں عالمِ ارواح کے گنہگار اپنی بے آب و گیاہ زمین چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور ان کو شاداب علاقوں میں آکر پناہ لینا پڑی۔ اسی طرح بالکل دوسرے اسباب کی بنا پر ۱۹۵۰ء میں دو ہزار ترک، لدّاخ کے راستے سے سری نگر میں آکر پناہ گزیں ہوئے اور آج بھی ان کے قبائل صفاکدل میں مقیم ہیں۔ ترک پاؤں توڑ کے نہیں بیٹھتے۔ غالب بھی کبھی مانعِ دشت نوردی نہیں رہے اور ان کی آوارگی سے آشنائی اور عافیت سے دشمنی، قدیمی اور ازلی ہے۔ کلکتے کا سفر بھی مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں تھا، فرماتے ہیں:

اگر بہ دل نہ خلد ہرچہ از نظر گذرد
زہے روانیِ عمرے کہ در سفر گذرد

مرزا غالب کے اصل و گوہر کا حال جیسا کہ انھوں نے مہرِ نیمروز کے دیباچے میں لکھا ہے، یہ ہے کہ ان کے بزرگ سمرقند میں آکر بس گئے تھے اور وہاں سے جس طرح سیلاب بلندی سے پستی کی طرف آتا ہے، ہندوستان کی طرف منتقل ہوئے:

"از واپسیان این قافلہ نیاے من کہ در قلمروِ ماوراء النہر سمرقند شہر مسقط الراس دے بود چوں سیل کہ از بالا بہ پستی آید۔ از سمرقند بہ ہند آمد۔"

اس علاقے کو بہت سے مورخین نے ایک بڑے حوض سے تشبیہ دی ہے جب اس میں پانی بھر جاتا ہے تو وہ ہندوستان کی طرف بہہ نکلتا ہے۔ غالب نے اس واقعے کو

اس طرح بیان کیا ہے : چوں سیل کہ از بالا بہ پستی آید از سمرقند بہ ہند آمد۔ درفش کاویانی میں زیادہ وضاحت سے لکھا ہے :

" بالجملہ سلجوقیان بعد زوال و برہم خوردن ہنگامۂ سلطنت در اقلیم وسیع الفضائے ماورا، النہر پراگندہ شدند از ان جملہ سلطان زادۂ ترسم خان کہ ما از تخمِ اویم سمرقند را بہر اقامت گزید۔ تا در عہدِ سلطنتِ شاہ عالم نیائے من از سمرقند بہ ہندوستان آمد۔"

غالب نے اپنے فارسی اشعار میں بھی اس علوے خاندان پر فخر کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

غالب از خاک پاک تورانیم　　لاجرم در نسب فرہ مندیم
ایبکیم از جماعتِ اتراک　　در تمامی زماہ دہ چندیم
فنِ آبائے ماکشاورزی ست　　مرزبان زادۂ سمرقندیم

یہ سمرقند کا علاقہ تہذیب و تمدن کا مرکز رہا ہے لیکن اس نے چینِ قبا اور طرفِ کلاہ کے بھی بہت سے مناظر دیکھے ہیں۔ سکندر اعظم ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں ہومر کی الیڈ (ILIAD) لیے ہوئے آیا اور اس نے اس سارے علاقے کو زیر و زبر کر دیا۔ فلسفیوں نے انسانی ہڈیوں کا سفوف ہاتھ میں لے لے کر بہت پوچھا کہ اس میں بادشاہ اور غلام کی تفریق کس طرح کی جائے لیکن سکندر نے انتقام کے جوش میں لاشوں کے پل بنا دیئے اور ایرانی تہذیب کے نادرۂ روزگار ایوانوں میں آگ لگا دی۔ اسی طرح تاتاریوں کا سیلاب اٹھا جس نے اپنی ہلاکت آفریں گرفت میں روس اور ہنگری تک سب کو لے لیا۔ اور ایسی وسیع و عریض حکومت قائم کی جو چین کے ساحل سے لے کر ڈینیوب (DANUBE) اور نیچے پنجاب تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس سمرقند نے تیمور کی جہاں کشائی اور جہاں بانی کے گونا گوں مناظر دیکھے جس میں سفاکی بھی شامل تھی، ادب نوازی بھی، معارف پروری بھی۔ چنگیز خاں کے پورے سو سال کے بعد سمرقند جاگا تھا اور اس طرح کہ وہ سائنس، ادب، فنِ تعمیر اور مصوری کا عالمی مرکز بن گیا تھا لیکن اب وسطِ ایشیا میں ایرانی

تہذیب کے نمائندے، عجم زدہ عرب نہیں تھے بلکہ ترک تھے اور ترکوں سے میری مراد، تورانی نسل کے وہ تمام لوگ ہیں جو وسطِ ایشیا اور چینی ترکستان میں بس گئے تھے اور ایران کو اپنا تہذیبی سرچشمہ سمجھتے تھے۔

وسطِ ایشیا سے بہت سی قومیں موج در موج ہندوستان میں داخل ہوئیں۔ اسی طرح مسلمان ترک ہندوستان میں آئے لیکن وہ حجاز کے عربوں اور اصفہان و شیراز کے ایرانیوں سے یکسر مختلف تھے۔ خلافت کمزور اور بے دست و پا ہوگئی تھی اور اس کے ویرانہ پر خود مختار ترکی ایرانی (TURKO-PERSIAN) حکومتوں کے محل تعمیر ہوگئے تھے۔ مسلسل فتحیابیوں نے مذہبی جذبے کو سرد کر دیا تھا اور اب یہ ترک برسرِ عام کہتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ یہ بات شرع کے مطابق ہے یا نہیں۔ جو بات حکومت کے لیے مفید ہے ہم اس کا حکم صادر کرنے میں پس و پیش نہیں کرتے۔ ان کے علاوہ تمام صوفیہ، اہلِ تقلید، اہلِ ظاہر اور اہلِ اختیار سے نبرد آزما تھے۔ ان کے نزدیک اقدار میں سب سے اہم قدر محبت تھی جس سے دل کی وسعتوں میں اضافہ ہوتا ہے، جذبات کی تہذیب ہوتی ہے، فرد کی اہمیت بڑھتی ہے، رواداری اور مساوات اور جمہوریت کی جڑیں سیراب ہوتی ہیں۔ داراشکوہ کی مجمع البحرین، شاہ غمگین کے خطوط، غالب کے اشعار اور شفقہ فیض کے مطالب سب یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس وقت ویدانت اور اسلامی تصوّف ہم آغوش ہوگئے تھے۔ ملتیں اہم نہیں رہی تھیں بلکہ ان کے مٹنے سے جو ایمان بنتا ہے وہ اہم تھا۔

ہندوستان میں ۱۲۰۶ء میں جو حکومت قائم ہوئی وہ مزاج اور کیفیت کے اعتبار سے ترکی ایرانی تھی یعنی اس کے آمیزہ میں ایران کا احساسِ جمال اور حسنِ تناسب اور ترکستان کی وسیع المشربی اور سخت کوشی دونوں شامل تھیں جو ہندوستان کی آریائی فضا میں اَن مل بے جوڑ نہیں تھی بلکہ اُس نے اس کے حسن کو نکھار دیا اور خود ایرانی تہذیب کے جسدِ مردہ میں نیا خونِ زندگی دوڑا دیا۔ لیکن ترکی ایرانی تہذیب کا احیاء دراصل مغلوں کے ذریعے ہوا، جب بابر نے اپنے

وطن فرغانہ کو چھوڑ کر ۱۵۲۶ء میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد ہندوستان میں قائم کی۔

غالب کا تعلق مغلوں سے براہ راست تھا وہ نسباً اور اصلاً اس قوم کے فرد تھے جس کا ایک قبیلہ دہلی کے تخت پر حکمراں تھا۔ ترکوں میں قدیم سے یہ قاعدہ ہے کہ باپ کے متروکے میں سے بیٹے کو تلوار کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔ غالب کو ورثے میں یہ ترک ایرانی ذہن تو ملا لیکن اپنے آبا کی تلوار نہ مل سکی۔ البتہ بزرگوں کو یہ تیر ٹوٹ کر ان کا قلم بن گیا: "شد تیرِ شکستہ نیاگاں قلمم"۔ شاعری کے میدان میں البتہ اس کی حیثیت تیرِ نیمکش کی ہوگئی ہے۔

یہ قبیلے جب ہندوستان آئے تو ان کی پشت پر صدیوں کی وراثت تھی۔ ان کے ساتھ ایک اجتماعی ذہن تھا، جس کے سارے نقش و نگار اسی ترکی ایرانی ماحول میں صورت پذیر ہوئے تھے۔ وہی علوے نسب کا احساس، وہی اسلاف کے کارناموں پر فخر۔ غالب ایک قطعہ میں لکھتے ہیں:

ساقی چو من پشنگی و افراسیابیم
دانی کہ اصلِ گوہرم از دودۂ جم ست
میراثِ جم کہ مے بود اکنوں بمن سپار
زیں پس رسد بہشت کہ میراثِ آدم ست

غالب کے یہاں جو جیغہ دستار پیچ و مالائے مروارید یا دربار و لمبر پر اتنا اصرار ہے، اس کا سرچشمہ بھی یہی ہے۔ ان قبیلوں میں عصبیت بھی بلا کی تھی۔ غالب کا تعلق ایک ترکوں میں قبیلۂ برلاس سے تھا اور مجھے تاشقند اور سمرقند کے قیام میں معلوم ہوا کہ اس قبیلہ میں یہ عصبیت کوٹ کوٹ کے بھری تھی۔ لڑائی ہے تو سالہا سال اور نسلاً بعد نسلٍ جاری رہے گی۔ دوستی ہے تو اپنی کھال کی جوتیاں بنا دیں گے۔ خود فاقہ کرلیں گے لیکن مہمان کے سامنے اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیں گے۔ اسی طرح غالب اپنی پنشن کا مقدمہ ایک دو برس نہیں مسلسل ۴۳ برس تک لڑتے رہے۔ انھوں نے اس زمانے کی صریح بے انصافیوں کے خلاف جس کی شکایت بعض ایماندار انگریزوں

کو بھی تھی اور خود مقامی حکام کے خلاف گورنر جنرل سے اپیل کی۔ جب وہاں بھی دادرسی نہ ہوئی تو کمپنی کے ڈائرکٹروں اور آخر میں ملکہ وکٹوریہ سے اپیل کی۔ ان کی دستنبو بھی ایک معنی میں اسی سلسلے کی ہوش مندانہ کوشش ہے۔ جب حامیانِ قتیل سے معرکے اور مجادلے ہوئے تو غالب اس طرح لڑے جیسے ترک اور تورانی لڑتے ہیں۔ ان ترکی قبیلوں کو اپنی عزت اور آبرو جان سے زیادہ عزیز تھی۔ غالب پر فاقے گذر رہے تھے لیکن دہلی کالج کی ملازمت کے معاملے میں انھوں نے صحیح یا غلط، عزت کا سودا نہیں کیا۔ جوئے کے الزام میں قید ہوئے تو جسیہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مجرم کی نہیں بلکہ بادشاہ کی سواری اس زنداں خانہ میں داخل ہو رہی ہے۔ اسی طرح جسم زخموں کی کثرت سے سروِ چراغاں بن گیا ہے اور موت ہے کہ روز دروازے پر دستک دیتی ہے لیکن جب توہین کا سوال پیدا ہوتا ہے یا ان کی حیثیتِ عرفی پر ضرب لگتی ہے تو وہ مولوی امین الدین پٹیالوی کے خلاف مرنے سے دو برس پہلے انگریزی عدالت میں ازالۂ حیثیت کی نالش کرتے ہیں۔ اثنائے تحقیقات میں دلّی کے بعض اہلِ قلم عدالت میں بلائے گئے کہ جو فقرے مدعی نے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کیے ہیں ان سے دشنام و فحش مفہوم ہوتا ہے یا نہیں۔ ان حضرات نے ملزم کو سزا سے بچانے کے لیے ان جملوں کے ایسے معانی بیان کیے جن سے ملزم کی بچت ہو جائے۔ کسی نے پوچھا حضرت یہ تو آپ کے شناسا ہیں، انھوں نے آپ کے برخلاف شہادت کیوں دی۔ فرمایا: میری بیکسی کی وجہ، شرافتِ نسبی ہے کیونکہ ہر شخص اپنی جنس کی طرف مائل ہوتا ہے اور چونکہ شرافتِ نسبی میں کوئی میرا ہم جنس نہیں ہے، اس لیے میرا کوئی ساتھ نہیں دیتا۔

بہر چہ درنگری جز بہ جنس مائل نیست
عیارِ بیکسیٔ من شرافتِ نسبی ست

قدیم ترکوں میں ایک قسم کی دنیا داری، عقلِ معاش، عیش پسندی اور پرکاری بھی ملتی ہے جو مختلف گروہوں سے مقابلے کی شدت سے آئی ہے اپنے مقاصد کو

حاصل کرنے کے لیے وہ کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھتے۔ غالب کا جو یہ نواب شمس الدین خاں یا خود اپنے بھائی مرزا یوسف یا اپنے عزیز دوست مفتی صدر الدین آزردہ کی بیوہ کے ساتھ تھا وہ ہمیں بڑا عجیب اور قابلِ اعتراض معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں ان کے طبقے کی مجبوریوں کو بھی دخل ہے اور اس قسم کی متوازی مثالیں ہمیں آخر دَورِ مغلیہ میں بھی مل جاتی ہیں، جہاں مقصد زیادہ اہم ہے اور 'طریقہ' کار ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔

ترکوں میں اصابت رائے کے ساتھ تنقید کی شدّت اور عدم برداشت پائی جاتی ہے۔ باوجود ہزار محبت اور عقیدت کے وہ اداروں اور شخصیتوں کی نکتہ چینی میں پس وپیش نہیں کرتے۔ جہانگیر کے دربار میں حضرت شیخ سلیم چشتی کے فیضِ روحانی کا ذکر تھا۔ قاضی نور اللہ شوستری کو حضرت علی کرم اللہ وجہ کے ساتھ یہ ذکر اچھا نہ معلوم ہوا، فرمایا: آنچہ مردک بود۔ جہانگیر حضرت شیخ سلیم چشتی کا بڑا معتقد تھا۔ ان ہی کی دعا سے پیدا ہوا تھا حکم دیا کہ مولانا کا سر قلم کر دیا جائے۔ نور جہاں نے رحم کی درخواست کی، اس نے کہا: جاناں دل دادہ ام نہ ایمان۔ اورنگ زیب نے اپنے استاد پر سخت نکتہ چینی کی تھی کہ تم نے مجھے یورپ کی تاریخ نہ پڑھائی اور ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ دنیا میں بس مغل ہی مغل ہیں۔ اسی طرح غالب نے باوجود مغل ہونے اور مغلیہ تہذیب سے محبت رکھنے کے آئینِ اکبری پر اعتراض کیا ہے اور اس پر آئینِ فرنگ اور مغربی داد و دانش کو ترجیح دی ہے۔ یہی معاملہ غالب کا شاعری کے میدان میں ہے۔ ایک خط میں حزیں کے ایک مطلع پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "یہ سقم ہے یہ عیب ہے حزیں تو آدمی تھا یہ مطلع جبریل کا بھی ہو تو سند نہ جانو۔"

غالب مغل تھے: ہاڑ چکلا، قد کشیدہ، رنگت خوب کھلتی ہوئی۔ ان کی رگوں میں وہی خون موج زن تھا جو مغل بادشاہوں کی رگوں میں تھا۔ ان ہی لوگوں کی طرح ان کو زندگی کی اچھی چیزوں سے محبت تھی۔ اچھا کھانا اچھا پینا، اچھا رہن سہن۔ بابر کی مادری زبان ترکی تھی اور غالب کے دادا کی زبان بھی ترکی تھی لیکن مغل ایرانی تمدن میں اس قدر سرشار تھے کہ انھوں نے اپنے کمالات کے جوہر فارسی میں دکھلائے اور اس کو

اپنی تہذیبی اور سرکاری زبان قرار دیا۔ پروفیسر آربری نے لکھا ہے کہ عربوں کے اثر سے فارسی زبان بھی صحرا زدہ ہوگئی تھی اور ہندوستان کے طبعی ماحول نے تو اس کے رنگ و آہنگ کو ایران کے طرز و روش سے اس قدر مختلف کر دیا تھا کہ ہندوستان کے اسلوب کو سبک ہندی قرار دیا گیا۔ اس طرز کی بہت عیب جوئی کی گئی ہے جس پر چنداں حیرت نہیں لیکن افسوس اس کی ہنر پوشی پر ہے۔ متاخرین شعرا کی بدولت اس میں جو حُسن کاری کا عنصر پیدا ہوا۔ اس کا عدم اعتراف بدترین قسم کی ناشکرگذاری ہے۔ اس قسم کا تخیل کہ غزالے بہ صحرائے جان می گذشت یا ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر سنگ، یا اُردو میں ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام یا آہو آجائیں گے خود شوق سے گردن ڈالے، ہندوستان ہی کے طبعی ماحول میں ممکن ہے، تبریز و طوس میں ممکن نہیں۔

غالب کے اجداد کو ہندوستان میں آکر جس ماحول اور مزاج سے سابقہ پڑا، وہ وسط ایشیا سے مختلف تھا۔ یہ لوگ جہاں آکر بسے وہ بالعموم مسطح اور کسی قدر مرتفع میدانوں پر مشتمل تھا جنھیں بڑے بڑے دریا سیراب کرتے ہیں۔ یہاں گھنے جنگل تھے یا وسیع و عریض میدان۔ یہاں کے موسم مقرر تھے اور ان میں زیادہ افراط و تفریط نہیں ہوتی تھی۔ یہاں حقیقت ایسے زمان میں کام کرتی ہے جو معمور و مسلسل ہے اور بہ اعتبار پیمایش دایری ہے۔ یہاں کائنات ناقابل اختتام صورت میں بے تحاشا پھیلی ہوئی تھی اور شدتِ حیات کے ساتھ دھڑک رہی ہے۔ بظاہر ان مختلف مناظر میں بہت فرق ہے لیکن غور کیجیے تو ساری موجودات اپنی کثرت اور بوقلمونی کے باوجود ایک حقیقت نظر آتی ہے۔ موضوع کی وحدت معروض کو اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے یا تصوف کی اصطلاح میں بندہ و بندہ نواز، عاشق و معشوق کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔ یہی خصوصیت ہندوستانی ذہن کی ہے وہ کائنات کی تعمیر میں اور نظامِ فکر کی تعمیر میں، متعدد اور مختلف مظاہر کو ایک کلیے کے تحت لاکر ہمیشہ ان میں وحدت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی عمل اس تہذیبی ورثے کے ساتھ ہوا جو

غالب کے اجداد اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس کو ہندوستانی ذہن نے ترکیب وامتزاج کے ذریعے اپنے رنگ میں رنگ لیا چنانچہ جن تصوری عناصر نے ہندوستان کے اجتماعی ذہن پر اثر ڈالا، وہ سب کے سب ہندوستان کی سرزمین میں پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ ان میں بہت سے باہر سے آئے تھے۔ ہندوستانی تہذیب میں دراوڑی، آریائی، ایرانی اور ترکی عناصر کی بڑی آمیزش ہے۔ البتہ وہی عناصر ہندوستانی تہذیب کا جزو بن سکے جو عام ملکی روح سے ہم آہنگ تھے۔ مغلوں کے زمانے میں جو نخل بندی اور پیوند کاری کے تجربات سے گذر چکے تھے، یہ تہذیبی نقش اور زیادہ حسین ہوگیا۔ انھوں نے ترکوں کی سخت کوشی، فراخدلی اور خودداری میں ایرانیوں کی لطافت اور شائستگی اور مساوات اور اخلاقی ضبط کی قلم لگاکر، ہندوستانی تہذیب کی اس طرح آبیاری کی کہ وہ ایک تناور درخت بن گئی اور اس کی جڑیں، جمالیاتی شعور اور تصوف کی انسان دوستی تک پہنچ گئیں۔ اس زمانے کی عمارتیں، تصویریں، تصوف کی تحریکیں اور شعر و موسیقی کے کارنامے سب اس امتزاج اور اتحاد پسندی کے آئینہ دار ہیں۔ مثال کے طور پر معرفت یا تصوف کے اس نئے راگ پر غور فرمائیے جو ہندوستان کے طبعی ماحول میں اسلامی اثر سے پیدا ہوا۔ اس میں عاشقانہ ذوق و شوق، سوز و ساز، تسلیم و رضا کے ساتھ مصلحانہ بلکہ مجاہدانہ جوش و خروش بھی ہے۔ ایک طرف نغمۂ عشق ہے، ذاتِ الٰہی کی محبت اور مرشد کی عقیدت سے معمور۔ اور دوسری طرف ترکوں کا نعرۂ جنگ ہے، ظاہری رسوم و روایات، عقائد و عبادات کے خلاف، یہاں معبودِ حقیقی کا تصور خالص باطنی تصور ہے جو بظاہر متضاد صفات کا جامع ہے۔ یہی صورت معشوقِ حقیقی کی ہے اور یہی کیفیت معشوقِ مجازی کی۔ پھر بھی ایک عارف کی نظر، اس کثرت میں وحدت کو ڈھونڈ لیتی ہے۔ خدا زمان و مکان سے باہر بھی ہے۔ تصور سے ماورا بھی۔ صفات و تعینات سے بری۔ داراشکوہ، طالب حسین شاہ حسنی، میرزا مظہر، میر، بیدل، غمگین اور غالب کے صوفیانہ خیالات کو سامنے رکھیے، سب میں یہی عجمی ہندی نے کارفرما ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہندو باطنیت اور اسلامی تصوف باہم مل گئے ہیں۔ اسی طرح فتحپور سیکری،

احمد آباد اور سیکری نگر کی عمارتوں میں۔ خیال اور دُھرپد میں، منوہر اور عبدالصمد کی تصویروں میں امیر خسرو، رحیم۔ فیضی اور غالب کی شاعری میں یہ امتزاجی لہر صاف نظر آتی ہے۔ یہاں امتیازات مٹ گئے ہیں اور فنونِ لطیفہ نے اپنے حدود کے اندر ہندوستانی روح کو پا لیا ہے۔

ترکی ایرانی شاعری میں غزل کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ یہ شاعر ایک خدا ایک حیات ایک ممات اور ایک حشر و نشر کے قائل تھے اور ادب میں غزل ایک ہی موضوع پر اپنی لامتناہی رنگارنگی اور موزوں الفاظ اور مناسب قافیے کے انتخاب کے ساتھ ایک خاصے کی چیز تھی۔ مضمون کے لحاظ سے اس کا خود کفالتی انداز یا اقلیدسی نقش و نگار کی طرح ایک شعر کا دوسرے شعر سے صرف باہمی صوتی، عمیق، تعلق اسی شعور کا شاعرانہ اظہار ہے۔ یہ ذہن پُرشور ریگستانوں اور فلکِ نیلگوں کی پہنائیوں میں پلا اور بڑھا تھا چنانچہ نسیب کی شکل میں۔ غزل کی ابتدا، عربستان میں ہوئی ترقی ایران میں۔ لیکن وہ اپنے نقطۂ کمال کو ہندوستان میں پہنچی۔ جہاں کی ریزہ کار فضا، کثرت میں وحدت کو دیکھ سکتی تھی اس قسم کی صنف اس کے مزاج اور طبیعت کے عین مطابق تھی۔ اس لیے غزل نے تمام ہندوستانی ادبیات پر اثر ڈالا اور خسرو، فیضی، عرفی و نظیری، طالب و کلیم، ظہوری و بیدل، میر و درد، مومن و غالب کے جوہر اسی سرزمین پر نمایاں ہوئے جن کی بدولت غزل اپنے منتہائے کمال پر پہنچ گئی اور یہ بات بھی نظر انداز کرنے کی نہیں ہے کہ غالب کے اختراعی کمالات کا اصلی میدان غزل ہی ہے نہ قصیدہ ہے نہ مثنوی، نہ مرثیہ نہ رباعی۔ قصیدے میں انھوں نے کہیں خاقانی کا تتبع کیا ہے، کہیں سلمان و ظہیر کا، کہیں عرفی و نظیری کا۔ اور زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر ایک منزل کامیابی سے طے کی ہے لیکن وہ قصیدے کو عرایض نویسی کا ایک رسمی ذریعہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے ایک قصیدے کو معمولی تصرف کے ساتھ دو دو ممدوحین کے سامنے پیش کیا اور اس کو صرف وسیلۂ روزگار سمجھا ہے۔ ان کی کوئی مثنوی فردوسی، رومی، نظامی یا جامی کے مقابلے پر پیش نہیں کی جا سکتی البتہ بعض بعض ٹکڑے بے مثل ہیں اور ہندی فارسی ادب کی آبرو۔

یہی صورت رباعی کی ہے کہ اس سرمایے کو فارسی کے رباعی گویوں سے کوئی بڑی نسبت نہیں۔ مولانا حالی نے لکھا ہے اور صحیح لکھا ہے کہ "مرزا کے کلام میں غزل کے سوا کوئی صنف شمار کے قابل نہیں ہے۔ مرزا کی موجودہ غزلیات گو بمقابلہ بعض شعرا کے تعداد میں کیسی ہی قلیل ہوں لیکن جس قدر منتخب اور برگزیدہ اشعار مرزا کی غزلیات میں موجود ہیں وہ تعداد میں کسی بڑے سے بڑے دیوان کے انتخابی اشعار سے کم نہیں ہیں۔"

یہی وجہ ہے کہ غالب کو جو خیالات اور احساسات اپنے ورثے، اپنے ماحول اور اپنی مخصوص افتادِ طبع کی بدولت ملے تھے ان کا جتنا خوب صورت اظہار غزل میں ہوا ہے وہ اور کسی صنف میں نہیں ہوا۔ ان کی تشبیہات استعارات و ترکیبات اپنے اندر جہانِ معنی چھپائے ہوئے ہیں، ان کے ذریعے غزل کا آرٹ نکھر گیا ہے اور زبان و بیان اپنی نئی بلندیوں تک پہنچ گئے ہیں۔ ان دریچوں سے ہم غالب کی اس حسین معنویت، امتزاجی بصیرت اور شوخ ذہانت کا نظارہ کر سکتے ہیں جو ایرانی ترکی ہندی خصوصیات کی نخل بندی کا نتیجہ ہے اور جو اُردو کی سب سے بڑی دولت ہے۔ غالب نے غزل کے ذریعے صدیوں کی بھولی بسری یادوں اور خون گشتہ تمناؤں کو آب و رنگ شاعری میں سمو کر پیش کیا ہے۔ نئی طرح سے نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے اور ایک عجیب توقع پر معدومِ محض ہونے کی تمنا کی ہے یا نشاط کار کو فرصتِ قلیل پر منحصر کیا ہے یا رخشِ عمر اور سوار کی بے اختیاری کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں۔ یا وجودِ بحر کو نمودِ صور پر مشتمل سمجھا ہے یا اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لیے یوں دہائی دی ہے کہ لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں۔ یا تسلیم کی خو پیدا کرنے کی کوشش کی ہے یا اپنے مذہب کو یوں ظاہر کیا ہے کہ جب ملتیں مٹ گئیں تو اجزائے ایماں ہوگئیں یا دوست کے سر انگشتِ حنائی کے تصور کو غنیمت سمجھا ہے یا بہار کا اثبات اس طرح بھی کیا ہے کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی یا چشم تنگ کو کثرتِ نظارہ سے وا کرنے کی صلاح دی ہے یا دنیا کو بازیچۂ اطفال سمجھا ہے یا یہ حسرت ظاہر کی ہے کہ بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے۔ یا کوہِ طور کی سیر کا نیا ولولہ پیدا کیا ہے یا گرم رفتاری

کا یہ عالم دکھایا ہے کہ راستے کے تمام خس و خاشاک کے جلنے سے راہ گیروں کے لیے راستہ صاف ہوگیا ہے۔ یادشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا سے تعبیر کیا ہے یا افراطِ شوق کو یوں ظاہر کیا ہے کہ شیشہ، خود بشکن بر سر پیمانہ، ما۔ آگے جانے کی یہ جلدی ہے کہ سایہ و سرچشمہ یعنی طوبیٰ و کوثر پر آرام گوارا نہیں یا رازِ نہاں دار پر کہنا چاہتا ہے، اور منبر پر نہیں۔ اس کا مسلک یہ ہے کہ سر آستانے پر اور قدم بت کدے میں۔ اعزازِ نفس کا یہ حال ہے کہ دانے کی لالچ میں گرفتار ہونے کو تیار نہیں بلکہ یہ چاہتا ہے کہ قفس کو اتنا اونچا کیا جائے کہ وہ اس کے آشیاں تک پہنچ جائے۔ مضبوط ہوش و خرد کا یہ عالم ہے کہ کیشِ مغاں پر غلبہ حاصل ہونے کی امید نہیں تو اس کا مذہب اختیار کرنے کو تیار ہے کہ اس طرح شراب جزیہ میں نہ آئے گی تو ہدیہ اور سوغات میں تو ضرور آئے گی۔ یا انسان کی بے بضاعتی اور مجبوری یہ کہ ہفت آسمان بگردش و ما درمیان او۔ دوسرے الفاظ میں قیدِ حیات اور بندِ غم دونوں ایک ہیں اور جوشِ تمنائے دیدار کا یہ حال کہ وہ آنسوؤں کی طرح پلکوں کے راستے سے ٹپکا جاتا ہے تاہم آرزوؤں اور ارادوں کا وہ ہجوم کہ معشوق سے کہتا ہے کہ تو آ، تا کہ آسمان کا یہ قاعدہ کہ وہ دوست کو دوست سے نہیں ملنے دیتا ہم دونوں مل کر بدل دیں اور حکم قضا کو رطلِ گراں کی گردش سے پھیر دیں اور اختلاط کے موقع پر ہم دونوں ایسے زور زور سے سانس لیں کہ صبح کا دم بند کر دیں اور اس کو یکجائی کی اطلاع نہ ہونے دیں ——— یہ اور قسم کے خیالات، غالبؔ کے یہاں بار بار ملتے ہیں جن میں زندگی کی حقیقتوں کا عرفان، اس کا نور و نکہت، جینے کا سلیقہ اور حوصلہ سب ہی شامل ہے اور جو ان کے کڑھے ہوئے ذہن اور رچے ہوئے جذبات کا نتیجہ ہیں۔

میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ ان خیالات کی گونج اُردو اور فارسی کے دوسرے شاعروں کے یہاں مطلق نہیں سنائی دیتی۔ لیکن یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ یہ تیور، یہ رچاؤ، یہ انداز و اسلوب۔ یہ طرح داری، یہ نشاطِ معنوی دوسرے کے یہاں اس درجے میں نہیں ہے اور یہ بات اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کسی میں وسطِ ایشیا کی

ہم جوئی اور قوی العزمی، ایران کی رنگینی و لطافت اور ہندوستان کی تاب و تپش، تحت الشعور میں ہم آمیز ہو کر شعر کے قالب میں ڈھل جائے۔ غالب کو خود اس معنوی وراثت کا پورا احساس تھا جو کئی واسطوں سے گزر کر ان کو ہندوستان میں ملی تھی۔ فرماتے ہیں کہ قضا و قدر نے جو کچھ عرب کے فتوحات کے وقت عجم سے چھینا اس کے عوض میں مجھے کہ میں بھی عجمی الاصل ہوں کچھ نہ کچھ دیا۔ جب آتش کدۂ ایران جل کر راکھ ہو گیا تو مجھے آتش کی جگہ نفس یعنی زبان دی اور جب بت خانہ ڈھ گیا تو مجھے ناقوس کی جگہ آہ و فغاں دی۔ شاہانِ عجم کے جھنڈوں کے موتی اتار لیے اور اس کے بدلے میں مجھے خامۂ گنجینہ فشاں عنایت کیا۔ اسی طرح ترکوں کے سر سے تاج لوٹ لیا اور مجھ کو شاعری میں اقبالِ کیانی مرحمت فرمایا۔ موتی، تاج میں سے توڑ لیے اور علم و دانش میں جڑ دیے یعنی جو کچھ علی الاعلان لوٹا تھا وہ مجھے سے دے دیا۔ آتش پرستوں سے جو شراب جزیے میں لے لی وہ مجھے ماہِ رمضان کی شبِ جمعہ کو بخش دی۔ خلاصہ یہ کہ جو کچھ پونجی میرے اجداد سے لوٹی تھی اس میں سے صرف مجھے زبان فریاد کرنے کے لیے بخش دی۔

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

رخ کشودند و لب ہرزہ سرایم بستند
دل ربودند و دو چشم نگرانم دادند

سوخت آتش کدہ ز آتش نفسم بخشیدند
ریخت بتخانہ، ز ناقوس فغانم دادند

گہر از رایت شاہانِ عجم برچیدند
بعوضِ خامۂ گنجینہ فشانم دادند

افسر از تارکِ ترکانِ پشنگی بردند
بہ سخن ناصیۂ فرِّ کیانم دادند

گوہر از تاج گسستند و بہ دانش بستند
ہر چہ بُردند بہ پیدا بہ نہانم دادند
ہر چہ در جزیہ زگبران مےِ ناب آوردند
بشبِ جمعۂ ماہ رمضانم دادند
ہر چہ از دستگہ پارس بہ یغما بُردند
تا بنالم ہم ازاں جملہ زبانم دادند

یوں تو ہندوستان پر ایران کا اثر دارا (DARIUS) کے زمانے سے شروع ہوتا ہے لیکن مغلوں کے زمانے میں ترکی ایرانی دھارے مل گئے تھے۔ ہندوستان کی خصوصیات کی آمیزش نے اس تہذیب کا حُسن ایسا نکھار دیا کہ ع
دیکھ آئینے کو کہتی تھی کہ اللہ ری میں

غالب کے یہاں جو نشاطِ مطالب کا رقص اور لفظِ کا حُسن ہے اس کا بھی سرچشمہ یہی ہے۔ ان کا انداز و اسلوب، ایرانی ہندی امتزاج کے اس نقطۂ ارتقا کو ظاہر کرتا ہے جس کو تاریخ عرصے سے طے کر رہی تھی اور جس کا فن تعمیر میں سب سے خوب صورت اظہار تاج محل کے مرمریں اور ہیرا تراش جسم میں نظر آتا ہے۔ غالب کی شاعری، افسون و افسانہ نہیں ہے، اس میں نفسِ گرم کی آمیزش ہے۔ چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو ہے، خونِ جگر کی کی نمود ہے۔ انھوں نے ہمیں نئے خیالات دیے ان کے ادا کرنے کا ایک نیا اسلوب دیا اور سوچنے کے لیے حکیمانہ انداز اور جانچنے کے لیے تنقیدی شعور۔ اس میں مغل قلم کی شگفتگی ہے، اس کا پُرمعنی اختصار ہے، اس کا ترکانہ بانکپن ہے۔ یہ انداز و اسلوب، حال اور مستقبل دونوں کے لیے اہم ہے۔

غالب کے نظریۂ حسن و عشق کی تعبیر میں بھی ان کی تمدنی وراثت، ان کی رنگا رنگ شخصیت اور ان کی نسل اور ان کے خاندان کو بڑا دخل ہے۔ وہ محبوب کے وصل کو بہارِ تماشائے گلستانِ حیات سمجھتے ہیں۔ دیر و حرم کو آئینۂ تکرارِ تمنا

اور عیشِ امروز کو زندگی کے لیے ضروری۔ انھوں نے جن سچائیوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ذہنی تجریہ نہیں بلکہ تجربے اور جذبے سے بھرپور ہونے کے باعث، مجازی مادی اور انسانی ہیں اور یہ آپ کو معلوم ہے کہ مرزا غالب نے اس وقت ہوش کی آنکھ کھولی جب مغلیہ سلطنت کی شمع بجھ رہی تھی۔ لارڈ لیک کی فوجیں دلی تک پہنچ گئی تھیں اور شہنشاہِ عالم و عالمیان کی حکومت قلعۂ معلیٰ تک رہ گئی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں یہ رقصِ شرر بھی ختم ہوگیا۔ نہ وہ قدح باقی رہا نہ وہ ساقی لیکن غالب، ان حوادث کو اپنے دریاے بیتابی کی ایک موجِ خوں سمجھ کر برداشت کرتے رہے اور اس ظلمت میں انھوں نے زندگی کو سنبھالا اور سنوارا بھی۔

غالب اس تہذیبی سلسلے کی کڑی ہیں جو ہمیں ازبکستان، ترکستان، تاجیکستان، افغانستان اور ایران سے ملاتی ہے اور یہی سبب ہے کہ جب حضرت پیر و مرشد ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے جشنِ غالب کی بین الاقوامی تنظیم میرے سپرد کی تو مجھے یونسکو پیرس میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین، ازبکستان میں ڈاکٹر شاہ اسلام محمود ف، روس میں پروفیسر غفور روف، اطالیہ میں پروفیسر بوسانی، انگلستان میں مسٹر رالف رسل، چیکوسلاویکیہ میں پروفیسر یان مارک، ایران میں آقاے صورت گر، کناڈا میں پروفیسر عبدالرحمان بارکر اور امریکہ میں پروفیسر شیل کے ہمنوا بنانے میں مطلق کوئی دشواری نہیں ہوئی اور ان سب کو میں نے مشرق سے مغرب تک غالب کا طرفدار ہی پایا۔

آخر وہ کیا چیز ہے جس نے غالب کو حلقۂ شام و سحر سے نکال کر جاوداں بنا دیا؟ میرے خیال میں وہ یہی ایشیائی ورثے کا تسلسل ہے جو ہمیں غالب کی انسان دوستی، آفاقیت، وسیع المشربی، دردمندی،

بے نیازانہ خوش طبعی اور معنیِ لفظِ آدمیت کی شکل میں از سرِ نو دستیاب ہوا ہے۔ یہ وہی مشرق کے شعور کی رَو ہے جو قدیم و جدید اور خواب و حقیقت کی وادیوں کے درمیان۔ بے پروائی اور رعنائی سے بہتی ہوئی اور نا آسودگی اور آرزو مندی کے گرد ابوں سے کھیلتی ہوئی عالمی ادب کے ماورائی سمندر سے جا ملتی ہے۔

غالب کا مقدمۂ پنشن

غالب کے ذہن کو سمجھنے کے لیے اُن اقتصادی دشواریوں کو ضرور سامنے رکھنا چاہیے جن میں وہ ۴۳ سال (یعنی کم و بیش ۱۸۲۶ ۱۸۶۹ء) برابر مبتلا رہے اور جنھوں نے مرتے وقت تک ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اِن مالی پریشانیوں میں اُن کے مقدمۂ پنشن کو خاص طور پر دخل ہے جس کی اصلی مثل کا خلاصہ ہم نیشنل آرکائیوز نئی دہلی کے شکریے کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

غالب کا مقدمۂ پنشن (خلاصۂ مثل مخزونہ نیشنل آرکائیوز نئی دہلی ۱۹۰۱-۱- ج ۔

ایک رجسٹر جس میں متعدد رپورٹیں داخل ہیں۔ (نیشنل آرکائیوز۔ دہلی)

۱۔ چیف سکریٹری گورنمنٹ کی یادداشت بنام منرتی ٹھسوپی پرنسپ سکریٹری گورنر جنرل آف انڈیا۔

اس کے ہمراہ چیف سکریٹری بمبئی گورنمنٹ کی چٹھی مورخہ ۷ دسمبر ۱۸۳۰ء اور ریزیڈنٹ

دہلی کا خط جس میں غالب کے مقدمۂ پنشن کا خلاصہ درج ہے ارسال کیے گئے ہیں۔
خط میں لکھا ہے کہ دائس پریزیڈنٹ اس بات سے اتفاق نہیں کرتے کہ غالب کا خاندان موجودہ پنشن سے زیادہ کا مستحق ہے۔

۲۔ مسٹر جان مالکم کی یادداشت بنام چیف سکریٹری۔
اس کے ہمراہ گورنروں کی تحقیقات کی تفصیلی رپورٹ کی نقل مورخہ ۳۰ر نومبر ۱۸۳۰ء ارسال کی گئی ہے۔ یہ تحقیقات اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ سند پر لارڈ لیک ہی کے دستخط ثبت ہیں اور یہ کہ احمد بخش خان کا چال چلن شک وشبہ سے بالاتر تھا۔

۳۔ مسٹر جارج سوئنٹن چیف سکریٹری کی یادداشت بنام ولیم مالکم ریزیڈنٹ دلی۔
اس کے ہمراہ چیف سکریٹری بمبئی گورنمنٹ کے ایک مراسلے کی نقل بھیجی گئی ہے۔ مراسلے میں کہا گیا ہے کہ جس پروانہ پر لارڈ لیک کی مہر ہے وہ صحیح معلوم ہوتا ہے نیز یہ ہدایت کی گئی ہے کہ اس پروانہ کو نواب شمس الدین خاں کو واپس کردیا جائے۔

۴۔ چیف سکریٹری گورنمنٹ کی یادداشت مورخہ ۱۹ر اگست ۱۸۳۰ء غالب کے پنشن کے معاملے کے بارے میں۔
اس میں کہا گیا ہے کہ نصراللہ (بیگ) خان نے جو نواب احمد بخش خاں والی ریاست فیروزپور کا داماد تھا۔ مرنے پر ماں ایک بیوہ تین بہنیں اور دو لڑکے (بھتیجے) چھوڑے خواجہ حاجی۔ نصراللہ بیگ خاں کے باپ کی بیوی کی بھتیجی کا لڑکا تھا اور نصراللہ بیگ خاں کے معاملات کا انتظام اس کے سپرد تھا۔ اس کی (نصراللہ بیگ خاں) وفات پر نواب احمد بخش خاں نے لارڈ لیک سے اپنی جاگیر کے متعلق پروانہ معافی حاصل کرلیا۔ شرط یہ تھی کہ نواب احمد بخش خاں نصراللہ بیگ خاں کے ورثا کے لیے مددمعاش مہیا کرے گا۔ نواب نے ناجائز طور سے خواجہ حاجی کو متوفی کے خاندان کا اہم ترین فرد بنادیا۔ اور اس کے لیے دو ہزار روپیہ سالانہ اور باقی تین ہزار سالانہ نصراللہ بیگ خاں کی والدہ اور غالب کے خاندان کی گزراوقات کے لیے مقرر کرایے۔ نصراللہ بیگ خاں کی والدہ کی وفات پر اُن کا حصہ ان کی سب سے

بڑی لڑکی کو ملا جس نے اپنی دو چھوٹی بہنوں کی کفالت اپنے ذمہ لے لی۔ اس انتظام میں غالب کے بھائی مرزا یوسف کے لیے کوئی رقم نہیں رکھی گئی تھی۔

یادداشت میں غالب کے ۱۸۲۸ء میں کلکتہ جانے اور ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء کو پرشین سکریٹری کی خدمت میں، اپنی عرضداشت پیش کرنے کا بھی ذکر ہے۔

غالب کا پنشن کیس ۸۹

فارن ۱۸۳۱ء ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

۲۲ اپریل نمبر ۱۰۸ نیشنل آرکائیوز۔ دہلی

غالب کی درخواست بنام جارج سوئنٹن سکریٹری پولیٹکل ڈپارٹمنٹ فورٹ ولیم معرو ہے کہ مبلغ دس ہزار سالانہ پنشن کے لیے ان کے حق کو تسلیم کیا جائے اور یہ رقم فیروزپور کے جاگیردار کی جاگیر (جس کی مالیت مبلغ ۲۵ ہزار ہوتی ہے) پر واجب الادا قرار دی جائے۔ وہ یہ بھی عرض کرتے ہیں کہ وہ دستاویز جس کے اندر مبلغ ۵ ہزار دینا طے ہوئے ہیں اور جسے فریقِ مخالف (نواب احمد بخش خاں) کی جانب سے داخل کیا گیا ہے۔ عرضی گزار کے پنشن کا پورا حق پاتے ہیں (جو مبلغ دس ہزار سالانہ ہوتا ہے) مانع نہیں ہونا چاہیے اور بہتر ہوگا کہ یہ پنشن براہِ راست سرکاری خزانے سے ادا کی جائے۔

غالب کا پنشن کیس ۱۰۹۴

کورٹ ریکارڈ بابت ۱۸۳۲ء کی نقل نیشنل آرکائیوز، دہلی

مورخہ یکم ستمبر ۱۸۳۲ء صفحات ۹۹۔ (نیز کچھ سادہ صفحے)

۱۸۳۶ء کا کورٹ ریکارڈ گورنمنٹ آف انڈیا کے مختلف افسران کی یادداشتوں اور رپورٹوں پر مشتمل ہے جو غالب کے مقدمہ بابت اضافہ پنشن کے مختلف پہلوؤں کے سلسلے میں مندرجہ ذیل حضرات کے نام ارسال کی گئی تھیں۔

۱۔ بنام مسٹر ہنری تھوبی پرنسیپ سکریٹری گورنر جنرل صفحات ۱۔۳

۲۔ بنام چیف سکریٹری سپریم گورنمنٹ فورٹ ولیم صفحات ۵۔۷

۳۔ چیف ریزیڈنٹ دہلی صفحات ۹۔۱۰ مورخہ ۳ راکتوبر ۱۸۳۰ء

۴۔ اسد اللہ خان کے مقدمہ میں چیف سکریٹری کا نوٹ صفحات ۱۳۔۲۶ مورخہ ۱۹ راگست ۱۸۳۰ء

۵۔ بنام این بی ایڈمنسٹن اسکوائر صفحات ۲۹۔۳۵ (نواب احمد بخش خاں کے حق میں فارسی پروانہ کا انگریزی ترجمہ صفحہ ۳۵۔۳۸)

۶۔ بنام لفٹیننٹ کرنل مالکم۔

۷۔ بنام ایل۔بی ایڈمنسٹن صفحات ۴۹۔۵۲

۸۔ بنام جارج سوئنٹن چیف سکریٹری ٹو گورنمنٹ فورٹ ولیم صفحات ۵۳۔۵۴

۹۔ پھٹی ہوئی فارسی دستاویز۔ خواجہ حاجی وغیرہ مرقوم ماہ جون ۱۸۰۶ء مطابق ۱۹ ربیع الاوّل ۱۲۳۱ھ

۱۰۔ درخواست اسد اللہ خاں بخدمت رائٹ آنریبل لارڈ ولیم بنٹنگ گورنر جنرل اِن کونسل کلکتہ۔ صفحات ۵۹۔۶۴

۱۱۔ بخدمت لارڈ ولیم کیونڈش گورنر جنرل آف انڈیا صفحات ۶۵۔۶۸

۱۲۔ بنام ایس فریزر۔ ڈپٹی سکریٹری ٹو گورنمنٹ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ فورٹ ولیم صفحات ۶۹۔۷۰ مورخہ ۲۵ رستمبر ۱۸۳۰ء

۱۳۔ آخر میں "دستخط محمد اسد اللہ خاں برادر زادہ نصر اللہ بیگ خاں جاگیردار سونک سونسا" بخدمت لارڈ ولیم بنٹنگ گورنر جنرل آف انڈیا فورٹ ولیم صفحات ۷۱۔۷۲

۱۴۔ بنام سی۔ نورس چیف سکریٹری ٹو بمبے گورنمنٹ صفحات ۸۵۔۸۶ مورخہ ۲۲ راکتوبر ۱۸۳۰ء

۱۵۔ بنام جارج سوئنٹن چیف سکریٹری ٹو گورنمنٹ۔ فورٹ ولیم۔ صفحات ۸۹۔۹۰ مورخہ ۲۷ رنومبر ۱۸۳۰ء

آخر میں "عرضداشت محمد اسد اللہ خاں برادر زادہ نصر اللہ بیگ خاں جاگیردار

سونک سونسا۔ بست و ہفتم نومبر ۱۸۳۰ء"

۱۶۔ بنام جارج سوئنٹن چیف سکریٹری ٹو گورنمنٹ فورٹ ولیم۔ صفحات ۹۳-۹۴

مورخہ ۲۷ جنوری ۱۸۳۱ء

۱۷۔ ازاسداللہ خاں بخدمت رائٹ آنریبل گورنر جنرل صفحات ۹۵-۹۸

غالب کا پنشن کیس

۷۹۱

نیشنل آرکائیوز، دہلی

فارن۔ ۱۸۳۳۔ ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

۱۳ اپریل ۸۰-۱

غالب کی درخواست بنام مسٹر سوئنٹن چیف سکریٹری

یہ درخواست ان خدمات پر مشتمل ہے جو اہلِ برطانیہ کے ہندوستان پر قابض ہونے سے پیشتر ان کے باپ اور چچا نے انجام دی تھیں۔ موخر الذکر برطانوی حکمرانوں کی جانب سے آگرہ کا حاکم تھا۔ سائل اس بات کی درخواست کرتا ہے کہ جو واقعات اس نے اپنی عرضی میں بیان کیے ہیں سرکاری ریکارڈ سے ان کی تصدیق کی جائے۔ زاں بعد اس سلسلے میں اسے ضروری سند (سرٹیفکیٹ) عنایت کیا جائے۔

۲۔ غالب کی درخواست بنام مسٹر سوئنٹن چیف سکریٹری

اس میں کہا گیا ہے کہ ۴ مارچ ۱۸۰۶ء کو برطانوی حکومت نے ان پچاس سواروں کا چارج جو اس سے پیشتر اس کے مرحوم چچا کی کمان میں تھے۔ فیروزپور کے جاگیردار نواب احمد بخش خاں کو دیا تھا۔ وہ درخواست کرتے ہیں کہ فیروزپور کی جاگیر میں ان کے حق کی رقم کا تعین کیا جائے۔

غالب کا پنشن کیس

۷۹۳

نیشنل آرکائیوز۔ دہلی

فارن ۱۸۳۶۔ ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

۵ دسمبر نمبر ۱۵۹-۶۱

۱۔ درخواست غالب بنام ڈبلیو ایچ میکناٹن۔ سکریٹری پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ فورٹ ولیم

چونکہ لیفٹنٹ گورنر آگرہ نے ان کی درخواست کو از روے شفقت ملاحظہ نہیں فرمایا اور گورنر جنرل نے ان کے فیصلے کو بحال رکھا ہے لہٰذا معروض ہے کہ سائل کے معاملے کو یا تو صدر دیوانی عدالت کلکتہ کے پاس منتقل کر دیا جائے یا انگلستان بادشاہ سلامت باجلاس کونسل کے حضور میں ارسال کر دیا جائے۔

۲۔ درخواست غالب بخدمت لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل آف انڈیا۔ فورٹ ولیم

سکریٹری پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ سے اس بات کی اطلاع پانے پر کہ ان کا دعویٰ خارج کر دیا گیا ہے غالب کی گورنر جنرل کے حضور میں معروض ہے کہ

۱۔ انھوں نے لفٹنٹ گورنر آگرہ کے فیصلے کے خلاف سات نکات کا اعتراض داخل کیا تھا اور درخواست کی تھی کہ ان کے جوابات ان سے (لفٹنٹ گورنر سے) مانگے جائیں۔

۲۔ اگر ان استفسارات کے جوابات آجائیں تو ان کی ایک نقل درخواست گزار کو مرحمت کی جائے لیکن اگر اس کی (جواب منگانے کی) ضرورت نہ سمجھی جائے تو ان کے بارے میں درخواست گزار کو مطمئن کیا جائے۔

۳۔ لہٰذا اب وہ ملتمسِ خدمت ہے کہ اس کے معاملے کو صدر دیوانی عدالت کلکتہ کے فیصلے کے لیے بھیج دیا جائے لیکن اگر عدالت کا فیصلہ اس کے خلاف ہو تو اسے ان وجوہ کے متعلق مطمئن کیا جائے جن کی بنا پر اس کا دعویٰ خارج کیا گیا ہے۔

۴۔ مزید برآں معروض ہے کہ اگر گورنر جنرل اس کے معاملے کو صدر دیوانی عدالت میں نہ بھیجنے کا فیصلہ کریں تو اس معاملے سے متعلق جملہ کاغذات انگلستان بادشاہ سلامت باجلاس کونسل کے فیصلے کے لیے بھیج دیئے جائیں۔

ملفوف جملہ کاغذات متعلقہ مقدمہ نیز مرقوم الصدر مکاتیب

نوٹ: اس درخواست کے جواب میں غالب کو سکریٹری پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کلکتہ کی جانب سے یہ اطلاع ملی کہ ان کے کاغذات کورٹ آف ڈایریکٹرس کو بھیجے جا رہے ہیں۔

غالب کا پنشن کیس

۹۷ء

فارن ۱۸۳۷ء۔ ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

نیشنل آرکائیوز۔ دہلی

۱۷ راپریل نمبر ۶۶۔ ۶۷

۱۔ درخواست غالب بنام ڈبلیو ایچ میکناٹن سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا فورٹ ولیم۔

معروض ہے کہ مبلغ ۲۰۳۰۰ روپیہ کا جو اس کا بقایا واجب الادا ہے مرحوم شمس الدین خاں کے ترکہ کے مبلغ ۲۶۰۰۰ روپیہ میں سے جو گورنمنٹ کے پاس جمع ہیں وضع کرلیا جائے اور شمس الدین خاں کی جائداد کی فروختگی سے سائل کا پچھلا پنشن کا بقایا بحساب مبلغ ۳۰۰۰ سالانہ تا اختتام اپریل ۱۸۳۵ء دلوایا جائے نیز کورٹ آف ڈائریکٹرس کے فیصلے تک اسے ۳۰۰۰ روپیہ سالانہ کی پنشن بلاناغہ ادا کرائی جائے۔

۲۔ غالب کے خط کے جواب میں سکریٹری گورنمنٹ نے ان کے مراسلہ قصیدہ فارسی کے بارے میں گورنر جنرل کی جانب سے اظہارِ خوشنودی کیا ہے۔

غالب کا پنشن کیس

۹۸ء۔ ۸۰۰

فارن۔ ۱۸۳۷ء۔ ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

۲۸ راگست نمبر ۹۳۔ ۹۵

۱۔ مسٹر ایچ میکناٹن سکریٹری ٹو گورنمنٹ آف انڈیا کے نام غالب کا وضاحتی مکتوب جس میں ان کے مقدمۂ پنشن سے متعلق جو کورٹ آف ڈائریکٹرس کے زیر سماعت تھا کچھ مزید معروضات درج ہیں۔

۲۔ غالب کی درخواست بخدمت لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل ان کونسل فورٹ ولیم۔

(الف: دو ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ جو پہلے خواجہ حاجی کو اور اس کے بعد اس کے

ورثا کو ملتا تھا اس کے خلاف اپیل ہے۔

ب : اگرچہ اس کے معاملہ سے متعلق تمام کاغذات داخل کیے جا چکے ہیں پھر بھی معاملہ کی صورت حال کا اختصار ضروری ہے اور سطور ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

ج : جبکہ چار سو سواروں کا رسالہ جو میرے چچا کی ماتحتی میں تھا توڑ اگیا تو اس میں سے پچاس سوار منتخب کر کے نواب احمد بخش خاں کی ماتحتی میں دے دیئے گئے۔ موخرالذکر نے خواجہ حاجی کی خدمات کو جو قدیم رسالے میں سب سے پرانا افسر تھا برقرار رکھا اور اسے ان پچاس سواروں کا افسر مقرر کیا۔ خواجہ حاجی محض ایک ملازم کی حیثیت رکھتا تھا جسے جملہ پندرہ ہزار سالانہ کی رقم میں سے جو سواروں کی نگہداشت کے واسطے منظور ہوئی تھی مبلغ دو ہزار روپیہ سالانہ کا الاؤنس ملتا تھا۔

خواجہ حاجی کی وفات پر اس کا منصب سابقہ شرایط کے مطابق اس کے لڑکوں کو دے دیا گیا۔ لیکن جب نواب احمد بخش خاں کی جاگیر ضبط ہوئی اور پچاس سواروں کا رسالہ توڑ دیا گیا تب بھی تعجب ہے کہ خواجہ حاجی کے وارثوں کے لیے دو ہزار روپیہ سالانہ کا وظیفہ برقرار رکھا گیا۔ اگرچہ مناسب بات یہ تھی کہ خواجہ حاجی کے ورثا کو ان کے خاندان کی خدمات شایستہ کے پیش نظر کچھ پنشن دے دی جاتی۔

د : مزید برآں ایں کہ میرے چچا نصر اللہ بیگ خاں کے لیے جاگیر کی آمدنی مبلغ ۲۵ ہزار روپیہ سالانہ طے ہوئے تھے۔ یہ پورے کا پورا وظیفہ میرے چچا کے وارثوں کو ملنا چاہیے تھا اور اس میں خواجہ حاجی اور اس کے وارثوں کا کوئی حصّہ نہیں ہونا چاہیے تھا بشرطیکہ موجودہ فیصلہ لارڈ لیک کی رپورٹ مورخہ ۴ مئی ۱۸۰۶ء کی بنیاد پر کیا جائے لیکن اگر کورٹ آف ڈایریکٹرس کا فیصلہ فارسی شقہ پر مبنی ہو تب بھی میرے چچا نصر اللہ بیگ خاں کے ورثا ہی پانچ ہزار روپیہ سالانہ پنشن کے مستحق ہیں۔ خواجہ حاجی کی زندگی میں مبلغ پانچ ہزار روپیہ سالانہ میں سے جو میرے چچا کے ورثا کے لیے مقرر ہوئے تھے اسے دو ہزار سالانہ کا وظیفہ دینے کی شاید کوئی توجیہ ہو سکے۔ مگر اس کے وارثوں کو اس رقم

(مبلغ دو ہزار روپیہ سالانہ) پر استحقاق جتانے کا کوئی حق نہیں ہے کیوں کہ ان کا نصراللہ بیگ خاں کے خاندان سے جو اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ تھے کوئی تعلق نہیں ہے۔

لہذا معروض خدمت ہے کہ خواجہ حاجی کے وارثوں کا دو ہزار سالانہ کے لیے استقرار حق کا دعویٰ باوجود لیفٹیننٹ گورنر کے سابقہ فیصلے کے جو ان کے حق میں تھا نامنظور کیا جائے اور اگر انھیں کوئی وظیفہ ملنا ہی ہے تو وہ انھیں اصل پندرہ ہزار روپیہ سالانہ کی رقم میں سے دیا جائے جو رسالے کی نگہداشت کے واسطے مقرر ہوئی تھی۔

۳۔ ڈبلیو ایچ آفیشیٹنگ چیف سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا فورٹ ولیم کی رپورٹ بابت اس امر کے کہ نصراللہ بیگ خاں کے انتقال کے بعد کن وجوہ کی بنا پر نواب احمد بخش خاں کو پندرہ ہزار روپیہ سالانہ کی رقم معاف کی گئی تھی۔

۴۔ فارسی شقہ لارڈ لیک نے ۷ رجون ۱۸۰۶ء کو لکھا تھا اور جس کے اندر نصراللہ بیگ خاں کے ورثا کو مبلغ پانچ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ دیا گیا تھا اور جس میں سے مبلغ دو ہزار روپیہ سالانہ خواجہ حاجی کے واسطے متعین کیے گئے تھے۔

۵۔ چیف سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا کی چٹھی مورخہ ۲۸ راگست ۱۸۳۷ء بنام مرزا غالب جس میں انھیں ہدایت کی گئی تھی کہ آیندہ جملہ درخواستیں اور کاغذات وغیرہ صرف لیفٹیننٹ گورنر آگرہ ہی کے توسط سے بھیجا کریں۔

غالب کا پنشن کیس

نیشنل آرکائیوز۔ دہلی

فارن ۱۸۴۲۔ ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل ۸۰۳۔۸۰۵

۲۹ رجون۔ نمبر ۱۲۸۔۳۰

۱۔ غالب کی چٹھی مورخہ ۲۰ رمئی ۱۸۴۲ء بنام ٹی ایچ میڈوک چیف سکریٹری ٹو گورنمنٹ آف انڈیا۔ الہ آباد

معروض ہے کہ ملفوفہ یادداشتیں جو اس کے اضافہ پنشن کی درخواست اور قصیدہ فارسی (جس کے اندر گورنر جنرل کی مدح سرائی کی گئی ہے) کے متعلق ہیں۔ لارڈ بہادر کی خدمت میں پیش کر کے ان پر موصوف کے احکام حاصل کر لیے جائیں۔ غالب یہ بھی درخواست کرتے ہیں کہ حسبِ سابق آیندہ بھی انھیں اپنی معروضات اور خطوط براہِ راست بذریعہ ڈاک بھیجنے کی اجازت دی جائے۔

۲۔ ملفوفہ یادداشت مورخہ ۲۰ مئی ۱۸۴۲ء بخدمت لارڈ ایڈن برا گورنر جنرل آف انڈیا میں اپنے دعوائے اضافہ پنشن سے متعلق خاص نکات پر زور دیا ہے اور عرض کیا ہے کہ ان کے چچا نصر اللہ بیگ خاں اپنی زندگی میں ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ کی جاگیر پر جو انھیں برطانوی سرکار کی طرف سے مرحمت ہوئی تھی، قابض تھے اور اس کے بالعوض چار سو سواروں کا رسالہ تیار رکھتے تھے۔ ان کی رفات پر ان کی جاگیر حکومت نے واپس لے لی۔ اور رسالہ توڑ دیا گیا۔ پھر بھی لارڈ لیک نے اپنی رپورٹ مورخہ ۴ رمئی ۱۸۰۶ء میں مرحوم کے خاندان کے لیے مبلغ دس ہزار روپیہ سالانہ کی پنشن کی سفارش کی۔ اس رقم کی ادائیگی نواب احمد بخش خاں کے ذمہ کی گئی۔ غالب کا بیان ہے کہ نواب صاحب نے ان کے خاندان کو مبلغ دس ہزار سالانہ میں سے صرف تین ہزار روپیہ سالانہ دیے اور بعد میں نواب صاحب کے ورثا بھی یہی رقم دیتے رہے۔ شمس الدین خاں کے قتل کے بعد فیروز پور جھرکہ کی جائداد حکومت نے ضبط کر لی۔

۱۸۲۸ء میں مقدمہ اس وقت کے پریزیڈنٹ ڈبلیو۔ بی بیلے کے تصفیے کے لیے دائر کیا گیا اور چار سال بعد لارڈ بینٹنگ نے اسے خارج کر دیا۔ ۱۸۳۸ء میں مرزا غالب نے اس معاملے کو پھر کورٹ آف ڈایریکٹرس کی نظر ثانی کے لیے پیش کیا۔ غالب عرض کرتے ہیں کہ پانچ سال گزر گئے مگر ہنوز کورٹ آف ڈایریکٹرس نے اپنے انقطاعی فیصلہ کا اعلان نہیں کیا۔ سائل اس بات کی بھی درخواست کرتا ہے کہ اسے اپنا پورا وظیفہ لینے کی اجازت عطا کی جائے اور چونکہ نئے گورنر جنرل کو پچھلے گورنر جنرل کے مقابلے میں زیادہ اختیارات عطا کیے گئے ہیں، سائل کی درخواست کو شرف قبول

بخشا جائے۔

۳۔ ٹی ایچ میڈوک سکریٹری ٹو گورنمنٹ آف انڈیا کی چٹھی بنام مرزا غالب۔

ٹی ایچ میڈوک لکھتے ہیں کہ:

پنشن اور وظیفہ وغیرہ کا فیصلہ سابق گورنمنٹ کر چکی ہیں جن کی کورٹ آف ڈایریکٹرس نے پورے طور پر توثیق کر دی ہے۔ آخر میں یہ اطلاع دی ہے کہ لارڈ صاحب اس موضوع پر کوئی اور درخواست قبول نہیں کر سکتے۔

غالب کا پنشن کیس

۸۰۶ - ۸۰۷

نیشنل آرکائیوز - دہلی

فارن ۱۸۴۲ - ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

۶ / جولائی نمبر ۱۴۲ - ۴۴

۱۔ غالب کی چٹھی مورخہ ۵ / جون ۱۸۴۲ء بنام ٹی ایچ میڈوک سکریٹری ٹو گورنمنٹ آف انڈیا۔

درخواست کرتے ہیں کہ ملفوف یادداشت کو مع اصل فارسی خط کے جو سکریٹری نے گورنر جنرل کو بھیجا تھا موخرالذکر کے ملاحظہ کے واسطے پیش کر دیں۔ غالب یہ بھی کہتے ہیں کہ ہنوز کورٹ آف ڈائریکٹرس کے یہاں سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

۲۔ ملفوف یادداشت مورخہ ۵ / جون ۱۸۴۲ء بخدمت لارڈ ایلن براگورنر جنرل ٹی ایچ منڈوک کی تحریر مورخہ ۳۰ / مئی ۱۸۴۲ء کے جواب میں معاملہ زیر بحث کے واقعات قلم بند کرتے ہیں جس میں (مسٹر میڈوک کی تحریر میں) اطلاع دی گئی ہے کہ اس بارے میں اور کوئی درخواست برائے ملاحظہ منظور نہ کی جائے گی۔

غالب کہتے ہیں کہ چونکہ وہ سابقہ گورنمنٹ کے فیصلے سے مطمئن نہیں تھے اس لیے انھوں نے لارڈ صاحب کے پیشرو سے درخواست کی تھی کہ ان کے معاملے کو کورٹ آف ڈائریکٹرس کے ملاحظے کے لیے بھیج دیا جائے۔ یہ استدعا ۱۸۳۶ء میں منظور ہوئی۔ دو سال بعد غالب نے کورٹ آف ڈائریکٹرس کے فیصلے کے بارے میں دریافت کیا تو

انھیں اطلاع دی گئی کہ یہ معاملہ ۱۸ رمئی ۱۸۳۰ء کو وہاں بھیج دیا گیا تھا۔ ۱۸۳۹ء تک کوئی جواب موصول نہیں ہوا لیکن سکریٹری میڈوک کے خط سے معلوم ہوا کہ کورٹ آف ڈائرکٹرس نے سابق گورنمنٹ کے فیصلے کو بحال رکھا ہے غالب اب گورنر جنرل سے درخواست کرتے ہیں کہ اس فیصلے کی ایک نقل مع اس کی تاریخ کے انھیں مرحمت فرمائی جائے۔

۳۔ کورٹ آف ڈائرکٹرس کی چٹھی مورخہ ۷ رفروری ۱۸۴۲ء کا اقتباس :

"اسد اللہ خاں کا دعویٰ مناسب وجوہ کی بنیاد پر خارج کر دیا گیا ہے۔"

یہ اقتباس غالب کو ایک وضاحتی چٹھی مورخہ ۱۵ رجون ۱۸۴۲ء (جس پر ٹی ایچ منڈوک کے دستخط ہیں) کے ذریعہ بھیجا گیا۔

غالب کا پنشن کیس

۸۰۸ لغایت ۸۰۹
نیشنل آرکائیوز۔ دہلی

۲۸ ردسمبر ۔ نمبر ۲۸۰-۸۳

۱۔ غالب کی چٹھی مورخہ ۲۹ رجولائی ۱۸۴۲ء بنام ٹی ایچ میڈوک سکریٹری ٹو گورنمنٹ درخواست ہے کہ ملفوف عرضی کو گورنر جنرل کے ملاحظہ کے واسطے پیش کر دیں اور جس تاریخ کو یہ عرضداشت انگلستان ارسال کی جائے اس سے مطلع فرمائیں۔

۲۔ ملفوف درخواست بخدمت لارڈ ایلن برا گورنر جنرل مورخہ ۲۹ رجولائی ۱۸۴۲ء درخواست ہے کہ کورٹ آف ڈائرکٹرس کے فیصلے کے خلاف اس کی درخواست اپیل کو ہر مجسٹی ملکہ معظمہ کے پاس روانہ فرمائیں۔

۳۔ ٹی ایچ میڈوک کی چٹھی مورخہ ۵ راگست ۱۸۴۲ء

گورنر نے سائل کی عرضداشت کو کورٹ آف ڈائرکٹرس کے پاس پہلی ڈاک سے بھیجنا منظور کر لیا ہے۔

۴۔ مرزا غالب کی چٹھی مورخہ ۱۵ راگست ۱۸۴۲ء بنام ٹی ایچ میڈوک۔

شکریے کے ساتھ مکتوب الیہ کی چٹھی مورخہ ۵ راگست ۱۸۴۲ء کی رسید دی ہے۔

غالب کا پنشن کیس

نیشنل آرکائیوز۔ دہلی
۸۱۰ - ۸۱۱

فارن ۱۸۴۴۔ ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

۲۳ نومبر نمبر ۷۰ - ۷۱

۱۔ کورٹ آف ڈائرکٹرس کے مکتوب مورخہ ۴ اکتوبر ۱۸۴۳ء کا اقتباس جو غالب کو بھیجا گیا۔

"یہ یادداشت کمیشن برائے تحقیق احوال ہندوستان کے پاس بھیج دی گئی ہے۔"

۲۔ غالب کی چٹھی بنام آئی۔کری سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا۔

معروض ہے کہ ملفوف یادداشت گور ۔ برل کے ملاحظے کے لیے پیش کر دی جائے۔

دستخط

رقیمہ نیاز امیدوار لطف و کرم

اسد اللہ

۳۔ غالب کی درخواست مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۸۴۴ء بخدمت سر ہنری ہارڈنگ گورنر جنرل

معروض ہے دو سال ہوئے کہ انھیں سر ٹی۔ ایچ میڈوک سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا نے مطلع کیا تھا کہ غالب کی یادداشت کورٹ آف ڈائرکٹرس کو بھیج دی گئی ہے لیکن ہنوز اپنے معاملے کے متعلق انھیں (غالب کو) اس کا جواب نہیں ملا۔

۴۔ فارن ڈپارٹمنٹ فورٹ ولیم کی چٹھی مو ۔ ۹ نومبر ۱۸۴۴ء

کورٹ آف ڈائرکٹرس کے یہاں سے کوئی ۔ اب موصول نہیں ہوا اور یہ کہ ان کی موجودہ درخواست کی ایک نقل ان کے (کورٹ آف ڈائرکٹرس) پاس بھیج دی جائے گی۔

غالب کا پنشن کیس

نیشنل آرکائیوز۔ دہلی
۸۱۲ - ۸۱۴

۱۰ فروری نمبر ۲۹۱ - ۲۹۳

۱۔ غالب کی چٹھی بنام مسٹر ایڈورڈ سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا۔

اس ملاقات کی یاد دہانی کی گئی ہے جو ان سے دہلی میں ہوئی تھی اور مزاج پرسی کی گئی ہے۔

۲۔ غالب کی چٹھی بنام مسٹر کری سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا۔

گورنر جنرل کے ملاحظے کے لیے اپنی درخواست کو ملفوف کیا ہے اور یہ اُمید کی گئی ہے کہ ان پر وہی کرم فرمائی جاری رہے گی جو مکتوب الیہ کے پیشروؤں سوئنٹن پرنسیب اسٹرلنگ میکناٹن اور میڈوک نے مبذول فرمائی تھی۔

۳۔ غالب کی درخواست بخدمت لارڈ ایلن برا گورنر جنرل۔

معروض ہے کہ گورنر جنرل کے دورۂ الہ آباد کے موقع پر انھیں (غالب کو) بتایا گیا تھا کہ کورٹ آف ڈائریکٹرس نے گورنمنٹ آف انڈیا کے فیصلے کو بحال رکھا ہے اس پر انھوں نے (غالب نے) ایک اور اپیل ہر مجسٹی ملکہ معظمہ کی خدمت میں روانہ کی تھی۔ ۵ راگست کو سائل کو مطلع کیا گیا کہ ان کا معاملہ انگلستان بھیج دیا گیا ہے۔ اسے ۱۸ مہینے گزر گئے لیکن انھیں کوئی جواب نہیں ملا۔ اس درخواست پر ۲۶ رجنوری ۱۸۴۳ء کی تاریخ پڑی ہے۔

۴۔ سکریٹری گورنر جنرل کی چٹھی مورخہ ۵ راگست ۱۸۴۲ء

اطلاع دی گئی ہے کہ غالب کی یادداشت اگلی ڈاک کے ذریعہ کورٹ آف ڈائریکٹرس کے پاس بھیج دی جائے گی۔

۵۔ مسٹر آئی کری سکریٹری گورنر جنرل کی چٹھی مورخہ ۳ رفروری ۱۸۴۴ء

اطلاع دی گئی ہے کہ ہنوز انگلستان کی سرکار کے یہاں سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ غالب نے ان دونوں مذکور الصدر چٹھیوں کی نقول اپنی درخواست مورخہ ۲۶ رجنوری ۱۸۴۳ء بخدمت گورنر جنرل کے ساتھ ملفوف کر دی تھی۔

غالب کا پنشن کیس

۸۱۵ - ۱۶
نیشنل آرکائیوز۔ دہلی

فارن ۱۸۵۶ ڈپارٹمنٹ پولیٹیکل

۱۹ ردسمبر نمبر ۸۳ - ۵

۱۔ تحریر مورخہ ۸ ردسمبر ۱۸۵۶ء بنام بی پی ایڈمنسٹن۔ سکریٹری گورنر جنرل

آف انڈیا باجلاس کونسل فورٹ ولیم۔

ملفوف درخواست اور منسلکہ کاغذات پیش کرتے ہوئے غالب التماس کرتے ہیں کہ انھیں گورنر جنرل کے ملاحظے کے واسطے پیش کر دیا جائے اور ازراہِ نوازش اس کی غالب کو اطلاع دی جائے۔

رقیمہ اسد اللہ خاں برادر زادہ نصر اللہ بیگ خاں
جاگیر دار سونک سونسا
مرقوم ہشتم دسمبر ۱۸۵۶ء عیسوی

۲۔ درخواست بخدمت جان وائیکاؤنٹ کیننگ گورنر جنرل باجلاس کونسل۔

غالب سر جارج کلرک کی ایک چٹھی اپنی درخواست کے ہمراہ ملفوف کرتے ہوئے اس بات کی تحقیق کرنا چاہتے ہیں کہ آیا ان کا معاملہ ہز مجسٹی ملکۂ معظمہ کی خدمت میں ۷ار مئی ۱۸۵۶ء کو ارسال کر دیا گیا ہے جیسا کہ انھیں اطلاع دی گئی تھی۔

عرضداشت اسد اللہ خاں برادر زادہ نصر اللہ بیگ خاں
جاگیر دار سونک سونسا
معروضہ ہشتم دسمبر ۱۸۵۶ء عیسوی

۳۔ نقل حکم گورنر جنرل

اس کے ہمراہ جارج کلرک کی چٹھی کو واپس کیا گیا ہے اور لکھا گیا ہے کہ جب کورٹ آف ڈائرکٹرس کا فیصلہ وصول ہوگا، اس سے غالب کو مطلع کیا جائے گا۔

غالب کے چند غیر مطبوعہ فارسی رقعات

حضرت غمگین کے نام

مرزا غالب کے مکتوب الیہم میں حضرت غمگین کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ غالب نے ان کی رباعیات کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے ذرے کو آفتاب اور کوزے میں دریا کو بند کر دیا ہے اور ان کے دیوانِ رباعیات میں وہ مطالب پوشیدہ ہیں جو مثنوی مولانا روم میں بھی نہیں[1]۔ ان رباعیات کا خطی نسخہ مکاشفات الاسرار، انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہے[2]۔ بلوم ہارٹ نے اس کا تعارف مندرجہ ذیل الفاظ میں کرایا ہے[3]:

"یہ سید علی دہلوی المعروف بہ حضرت جی المتخلص بہ غمگین کی متصوفانہ رباعیات کا دیوان ہے۔ اس کے فارسی مقدمہ میں مصنف نے اپنے حالات لکھے ہیں جن کی ابتدا ان اردو اشعار سے ہوتی ہے:

---

[1] رقعات غالب و غمگین (قلمی) غمگین اکادمی گوالیار خط نمبر ۲

[2] مکاشفات الاسرار: انڈیا آفس لائبریری لندن نمبر اردو ۱۱۵

[3] فہرست ہندوستانی مخطوطات (انڈیا آفس) مرتبہ بلوم ہارٹ ص ۱۱۹ مطبوعہ ۱۹۲۶ء۔ نیز مکاشفات الاسرار: نسخہ لندن ورق ۲ ب۔

ایک عمر رہی میری اللہ کی جنگ — دیتا ہیں رہا شکست سو سو فرہنگ
غمگین مغلوب اب ہوا ہوں ایسا — نہ فوج رہی، نہ میں، نہ وہ نام و ننگ۔

فارسی مقدمے کی ابتدا کے الفاظ یہ ہیں :

"حامداً بعد حمد حقیقت و نعت صورت خود، سید علی عرف حضرت جی متخلص غمگین متوطن دہلی قادری نقشبندی ابو العلائی المشرب مجملاً از احوال خود بغرض احباب صفوت انتساب می رساند۔"

شروع کی رباعیوں میں بسم اللہ کی تفسیر ہے۔ ابتدا کا شعر ہے :

بسم اللہ میں سب ہے جو کہ قرآن میں ہے
قرآن میں وہ ہے جو کہ انسان میں ہے

(حضرت) سید علی دہلوی گوالیار کے ساکن تھے۔ ان کے والد کا نام سید محمد تھا۔ جو دہلی کے گورنر شاہ نظام الدین احمد قادری (تلمیذ نگین) کے بھتیجے تھے غمگین کے والد کا انتقال اس وقت ہوا جب اوّل الذکر کی عمر بارہ برس کی تھی۔ ۲۵ برس کی عمر میں درویشی اختیار کی اور سید فتح علی رضوی سے بیعت ہوئے۔ اس کے بعد گوالیار سے پٹنے اور پٹنے سے گیا کا سفر کیا۔ گیا میں ان کو حضرت شاہ ابو البرکاتؒ کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا۔ جن کے مشورے سے وہ بارہ برس تک پٹنے میں رہے۔ یہاں انھوں نے خواجہ ابو الحسین سے فیض باطنی حاصل کیا اور ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ حضرت غمگین نے خواجہ ابو الحسین اور سید فتح علی دونوں کے سلسلے بھی بیان کیے ہیں :

"مکاشفات الاسرار کا یہ دیباچہ برہان پور میں لکھا گیا تھا جب غمگینؒ کی عمر ساٹھ برس کی تھی۔ اس کے آخر میں انھوں نے لکھا ہے کہ اس سے قبل وہ ایک دیوان مرتب کر چکے تھے جس میں ان کی زندگی کے کچھ حالات درج ہیں۔ اسی کے بعض اشعار دیوان مکاشفات الاسرار میں شامل کر دیے ہیں جو انھوں نے مرزا اسد اللہ خاں غالب کے لیے مرتب کیا تھا۔ یہ نسخہ مصنف کا دستخطی معلوم ہوتا ہے ....."

یہاں بلوم ہارٹ نے غالب پر ڈیڑھ سطری حاشیے میں دو فاحش غلطیاں کی ہیں۔ لکھا ہے کہ ان کا انتقال کلکتہ میں اور ۱۸۷۲ء میں ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں صحیح نہیں۔

مکاشفات الاسرار[1] میں حضرت غمگین نے اپنے حالات لکھے ہیں۔ اس لیے دیباچہ اہمیت سے خالی نہیں۔ یہاں اس کے چند اہم حصّے نقل کیے جاتے ہیں:

"مجملاً از احوال خود بغرض احباب صفوت انتساب می رساند کہ ایں فقیر ابن سیّد محمّد بن سیّد احمد سیّد شاہ پیر بن سیّد محی الدّین بن سیّد شیر محمّد القادری کہ در برہان پور آسودہ اند و زیارت گاہ خلائق اند از اولاد سیّد محی الدّین عبدالقادر جیلانی[2] است رضی اللہ تعالیٰ عنہ و رحمۃ اللہ علیہم اجمعین و جدۂ فقیر بنتِ خواجہ الٰہی بن خواجہ بہاؤ الدّین بن خواجہ عبداللہ المشتہر بہ خواجہ خورد محقق ابن خواجہ باقی باللہ الحسنی المتخلص بہ بیرنگ قدس اللہ اسرارہم است کہ در دہلی زیارت گاہ خلائق اند .... فقیر دوازدہ سال بود کہ والدم بعالم بقا رحلت فرمودہ بودند و گاہ گاہ ایں خیال می آمد کہ از کسے دوست حق بہ پیوندم و تعلیم راہ حق از و حاصل نمایم۔ چوں بہ عمر بست و پنج سالگی رسیدم بتحصیل علوم مشغولی ورزیدم و حینیکہ عمر بہ بست و نہ سالگی رسید شبے در خواب دیدم کہ شخصے می گوید کہ تراعم تو سیّد شاہ نظام الدّین[3] احمد قادری رحمۃ اللہ می طلبند۔"

اس خواب کی تعبیر حضرت فتح علی شاہ گردیزی نے بیان کی اور فرمایا:

"کہ تعبیر ایں خواب ہمیں است کہ ترا مبارکباد بہ روز جمعہ پیش ما آئی۔

پس روزِ جمعہ حسب ارشاد رسیدم و از دولتِ بیعت در طریقہ فائز گشتم۔"

میر فتح علی شاہ کی ہدایت کے مطابق غمگین پٹنے میں حضرت خواجہ ابوالبرکات کی خدمت

---

[1] مکاشفات الاسرار نسخۂ لندن۔ دیباچہ

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ سندھیا مولفہ بابو رگھناتھ داس مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ ۱۹۰۷ء، ص ۱۰۹ الخ

میں حاضر ہوئے اور انھوں نے چلتے وقت دو سلسلوں کی اجازت دی:

"وقت رخصت مرا اجازت دو سلسلہ یکے قادریہ و دیگر چشتیہ عطا فرمودند بعد ازاں فقیر در بلدۂ گوالیار چند سال در صحبت آں بزرگواران فائدہ ہا ربود۔"

اس دیباچے سے حضرت غمگین کی ادبی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے:

"از زمان سابق دیوانِ ریختہ گفتہ بودم آں را دور کردم و الحال کہ عمر بہ شصت سالگی رسیدہ انچہ کہ واردات بر من غالب بودند موافق آں ہا دیوان دیگر در حالات و واردات و ذوق و شوق حقیقی و مجازی خود ترتیب دادم و بعضے غزلیات مخصوصۂ دیوانِ سابق دریں دیوان لاحق مندرج ساختم و چوں دیوان نو بہ اتمام رسید و واردات و غلبات و کیفیات بر دلم استیلا داشت۔ خواستم کہ برائے برادرِ دینی عزیز از جان اسد اللہ خاں میرزا نوشہ متخلص بہ غالب و اسد کہ دریں زمانہ در نظم و نثر نظیر خود ندارند ..... ترتیب دہم۔"

حضرت غمگین نے مکاشفات الاسرار کی شرح بھی لکھی ہے جس کا نام مراتِ حقیقت ہے۔ اس کی "شانِ نزول" یہ ہے:

"یک روز در باغچہ نشستہ بودند کہ مہاراجہ عالی جاہ بہادر (دولت راؤ سندھیا) برائے آں جناب (خواجہ ابو الحسن) تیار کنایندہ بود، سخنے (خواجہ ابو الحسن) فرمودند۔ کمال باریک۔ و از حاضراں فرمودند کہ معنی ایں بیان کنید۔ ہر یک از یاراں موافق استعداد خود عرض نمود۔ فقیر را ہم گفتند کہ تو ہم چیزے بگو۔ من ہم موافق استعداد خود عرض نمودم۔ دیدم کہ بہ چہرۂ مبارکش بشاشتے پیدا آمدہ .... بعد پنج سال اسرار ہا در دل فقیر جوش آوردند کہ طاقت تحمل نماند ناچار یک دیوان ہفت صد غزل گفتم۔ بارے قدرے تسکین حاصل شد۔ باز اسرار ہا در دل پیدا آمدن گرفتند۔

بازیک دیوان رباعیات قریب یک ہزار و ہشت صد رباعی گفتہ شد و چند روز خاموش ماندم۔ بعد دو سہ سال بار اسرار ہا جوش آوردند و دوستان من نیز گفتند کہ (کسے) کتاب نثر باید گفت (؟) کہ تا اسرار و مسائل تصوف واضح شوند و بہ آسانی در فہم آیند و نام آں دوستاں در دیباچہ نوشتہ ام۔ پس ایں کتاب نوشتہ شد۔ ایں ہمہ از برکت زبان مبارک آں جناب است والا من آنم کہ من دانم[1]

حضرت غمگین نے ایک کتاب شغل و اشغال میں بھی لکھی ہے جو ارشاد الحسینی کے نام سے مشہور ہے۔ اس لیے کہ حضرت سید فتح علی گردیزی کے ارشادات پر مشتمل ہے۔ اس کا دوسرا نام جواہر نفیسہ ہے۔ اس کے دیباچے میں فرماتے ہیں:

"می گوید فقیر حقیر.... شرف اندوز پا بوس مخدومی سیدی.... فتح علی حسینی الرضوی الگردیزی ثم الشاہ جہاں آبادی دام ظلہٗ..... شدم و بیعت نمودم۔ شب و روز در خدمت شریف حاضر می بودم و جاروب کشی آستانہ متبرکہ می کردم.... و در عرصہ سی و یک سال آں چہ از زبان در فشاں ارشاد می شد آں را در صدف سینہ نگاہ می داشتم و می سپردم در خزینۂ حافظہ اذکار و اشغال و مراقبہ و مشاہدہ و لطائف و مقامات وغیرہ"[2]

حضرت غمگین کے حالات ان کی تصانیف کے علاوہ دوسرے بزرگوں کی ملفوظات میں بھی ملتے ہیں۔ کیفیت العارفین میں لکھا ہے:

"چوں حضرت قطب العاشقین (حضرت ابوالبرکاتؒ) ہجوم خلائق بہ خود دیدند، درآں زماں اکثر طالبان راہ را جہت تربیت یافتن باطن تفویض خلف الرشید خود حضرت خواجہ ابوالحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ می نمودند چنانچہ درآں روزہا سید علی شاہ از گوالیار طالب نعمت باطنیہ گشتہ بہ خدمت

---

[1] مرات حقیقت، خطی نسخہ مملوکہ غمگین اکادمی گوالیار، ورق ۳۰۶

[2] جواہر نفیسہ (قلمی) دیباچہ، غمگین اکادمی گوالیار۔ اس کتاب کا مادۂ تاریخ "غریب" ہے جس سے ۱۲۱۲ھ نکلتی ہے (۱۷۹۷ء)۔

حضرت قطب العاشقین آمدہ تربیت یافتہ، مشرف از خلافت از خواجہ
ابوالحسین صاحب، گردیدہ مراجعت بہ سمت گوالیار کردند۔ آں جا بعد
از دو سال حسبِ استدعاے راجہ دولت راؤ سندھیا مع اخراجات
جہت رونق افروزیٔ حضرت قطب العاشقین در شہر عظیم آباد آمدند و
برائے تشریف بری آں حضرت تذکرہ آوردند۔ از آں جا کہ حضرت
قطب العاشقین را رغبت حشم و خدم در مزاج ہیچ نہ بود۔ از آں جا
صدائے نہ برخاست۔ الّا خلف الرشید آں حضرت خواجہ ابوالحسین صاحب
ایں امر را قبول نمودند.... وقتیکہ خواجہ ابوالحسین صاحب در گوالیار
رسیدہ.... متعلقاں را نیز از شہر عظیم آباد طلبیدند۔ بعد از دو سال
حضرت قطب العاشقین نیز کہ خلف الرشید خود را از دیگر فرزندان عزیز تر
داشتند تاب مفارقت نیاوردہ..... خود مع دیگر لواحقاں عزم
سفر سمت گوالیار پرداختند[1]۔"

یہ ماخذ سوانح غمگین کے سلسلے میں اہم ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان سے نہ تو تاریخ ولادت معلوم ہوتی ہے اور نہ تاریخ وفات۔ غمگین اکادمی میں ایک وظیفے کی کتاب ہے اس میں حافظ میاں عبدالرزاق عرف میاں میرن علی المتخلص بہ رزاق کے قلم سے حضرت غمگین کی تاریخ ولادت یکم صفر ۱۱۶۷ھ (۱۷۵۳ء) اور تاریخ وفات ۳ صفر ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء) لکھی ہوئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو وہ سابقہ بیانات کی رو سے ۲۹ سال کی عمر یعنی ۱۱۹۶ھ/ ۱۷۸۲ء میں بیعت ہوئے اور ان کی نئی ادبی زندگی کا آغاز ۶۰ سال کی عمر یعنی ۱۲۲۷ھ (۱۸۱۲ء) میں ہوا۔

غمگین کی وفات پر نواب مصطفٰی خاں شیفتہ نے ایک قطعہ تاریخ کہا ہے جس سے رزاق

---

[1] کیفیت العارفین و نسبت العاشقین مطبوعہ ۱۲۵۰ھ مؤلفہ سید شاہ عطا حسین ابن شاہ عبدالرزاق فانی عظیم آبادی المتوفی ۱۳۱۱ھ/ ۱۸۹۴ء مطبع گیا (بہار) ص ۲۰۹۔

کی تصدیق ہوتی ہے :

به عرف حضرت و غمگین تخلص — شده سید علی فخر زمانی
به صورت سالکِ راهِ طریقت — به معنی شاه ملکِ کام رانی
به دیده محو دیدارِ خدا بود — به دل آگه ز اسرارِ نهانی
بطونش دیدهٔ کحل البصیرت — ظهورش سرمهٔ چشم معانی
دلش چوں یافت ذوقِ رب ارنی — خطاب آمد که تو درخود نمانی
به یک شنبه سوم روز صفر شد — کلیم آسا به زیر کوه فانی
ز دل آہے کشیدہ شیفتہ گفت — به برد او را صدائے لن ترانی[1]

۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء

غمگین کا ذکر بعض تذکروں میں بھی ہے۔ عمدۂ منتخبہ (تذکرۂ سرور) میں لکھا ہے[2]:

"غمگین تخلص۔ میر سید علی۔ خلف الرشید میر سید محمد مرحوم برادرزادۂ حقائق و معارف آگاہ سید شاہ نظام الدین احمد قادری، ناظم صوبۂ دار الخلافہ۔ تشریح بزرگی و حسب و نسب محتاج بہ تحریر نیست۔ مرد بامروت و قابل است۔ از تصانیف اوست :

تو نے صیاد نیا ظلم یہ ایجاد کیا — بال و پر توڑ قفس سے مجھے آزاد کیا

تیرے ثانی اگر کوئی بشر ہووے تو میں جانوں
بشر تو کیا اگر شمس و قمر ہووے تو میں جانوں

ہجر میں اس کے دل جینے سے میرا سیر ہے — اے اجل بہر خدا آجلد اب کیا دیر ہے

دل اس کو دیا اب کیا تدبیر سے ہوتا ہے
جو کام کہ ہوتا ہے تقدیر سے ہوتا ہے

سوائے تیرے نہیں کوئی یار آنکھوں میں — پھرے ہے تو ہی تو لیل و نہار آنکھوں میں

---

[1] بشکریۂ پیرزادہ ہاشمی میاں سید رضا محمد صاحب حضرت جی۔
[2] عمدۂ منتخبہ (تذکرۂ سرور)، عکس نسخۂ انڈیا آفس، ورق ۲۹۲

مہرباں کوئی مرا جز غم دلدار نہیں
خس کا شعلے کے سوا کوئی خریدار نہیں

مژگاں کہے ہے اس کا گر تیر ہے تو میں ہوں
اور دل کہے ہے میرا نخچیر ہے تو میں ہوں

عشق میں رو رو کے جو یہ داغ دل دھوتی ہے شمع
رشتۂ الفت کو پروانے سے کیوں کھوتی ہے شمع

بلبل ہے اگر بہار سے خوش ہم اپنے ہیں گل عذار سے خوش

دل کے لگ جانے کا یاروں سے کہوں کیا باعث
ایک قصہ ہے جو ناحق میں کہوں کیا باعث

عاشق ہوا ہے میرا یہ دل اس کی آن پر
اللہ کیسی آن بنی میری جان پر

اس ابر میں مے پینا مستوں کو جواز آیا
ساقی مع مے آیا مطرب مع ساز آیا"

عیار الشعرا میں خوب چند ذکا نے لکھا ہے[1]:

"میر سید علی غمگین .... جوان گرم اختلاط و خوش خلق و شگفتہ بیان، سعادت آثار، ستودہ اطوار، پُر حلم و حیا معلوم شد۔ بہ اصلاحِ سعادت یار خاں رنگین گلہائے اشعار آب دار خود را رنگ و بوے تازہ بخشندہ ہمگی دیوان معروف او نظر ایں فقیر انواع المعانی در آمدہ۔"

اس کے بعد نمونتہً یہ سات شعر دیے ہیں:

مرا اس عشق کی دولت سے چہرہ ارغوانی ہے
نکلتا ہے جو اشک آنکھوں سے میرا ارغوانی ہے

میرے صیاد نیا ظلم یہ ایجاد کیا بال و پر توڑ قفس سے مجھے آزاد کیا

---

[1] عیار الشعرا: عکس مخطوطۂ لندن۔

وہ یاں کوئی مرا جز غم دلدار نہیں   خسرو کی شعلے کے سوا کوئی خریدار نہیں

یہ داغ عشق نہ ہو دور اپنے سینے سے
کہیں مٹا ہے کھدا حرف بھی نگینے سے

گو سیہ بخت ہوا، پر سرمۂ بینائی ہوں   جو کہ دیکھے ہے سو آنکھوں سے لگاتا ہے مجھے

مضطرب تھا دل اپنا جوں پارا
آخر اس شوخ نے جالا مارا

ایک مدت رہے (ہم) عشقِ بتاں میں غمگیں
بعد ازاں کعبہ کو بھی کر کے سفر دیکھ لیا

سرور اور ذکا کے تذکروں میں جن اشعار کو منتخب کیا گیا ہے وہ موجودہ دیوانِ غمگین میں نہیں ہیں۔ اس لیے قرینۂ غالب ہے کہ یہ اشعار اس دیوانِ اوّل کے ہیں جو ۱۱۹۷ھ سے پہلے ترتیب دیا گیا تھا اور جو بیعت کے بعد غمگین نے خود ہی مسترد کر دیا تھا۔

غمگین کا ذکر مجموعۂ نغز میں بھی ہے۔ اس کا یہ اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

"غمگین تخلص ..... جوانے نیک زندگانی، کشادہ پیشانی، خوش اختلاط مستحکم ارتباط، یار باش، محبت تلاش، مخلص نواز، مخالف گداز، باعزو تمکین شاگرد سعادت یار خاں رنگین است۔ علی قدر حال خط نسق (کذا) می نویسد و کم کم فکر سخن می گزنید۔ خوش زندگانی می کند و با فرح و سرور ایام بے بدل جوانی بکام دل بسر می برد۔ بہر حال ایں چار بیت منسوب بدوست:

(۱) میرے صیاد نے کیا ظلم ..... الخ

(۲) یہ داغ عشق نہ ہو دور ..... الخ

(۳) میرا اس عشق کی دولت سے .....

(۴) گو سیہ بخت ہوں پر سرمۂ بینائی ہوں
جو کہ دیکھے ہے سو آنکھوں سے لگاتا ہے مجھے

ایں شعر سرقہ طالب کلیم است۔ اما بہ زبان خود خوب گفتہ[1]

---

[1] مجموعۂ نغز، جلد دوم، طبع لاہور، ص ۳۰ و ۳۱

مجالس رنگین میں غمگین کا ذکر دو جگہ آیا ہے۔ ایک جگہ انھوں نے غمگین کو اپنا شاگرد لکھا ہے اور اپنی وہ غزل دی ہے (مان کر۔ جان کر) جو انھوں نے جرأت کی زمین میں غمگین کی فرمائش پر فی البدیہہ کہی تھی[1]۔ دوسرے موقع پر غمگین کے دس شعر نقل کیے ہیں جو انھوں نے ڈھاکہ میں چند دوستوں کے سامنے اور ایک کشتی کی سواری کے دوران میں پڑھے تھے[2]۔
غمگین نے بھی رنگین کی استادی کا اعتراف کیا ہے۔ قطعۂ تاریخ میں لکھا ہے[3]:

جب استاد رنگیں جہاں سے گئے — تو ایک یادگاری رہی ریختی
خرد نے کہا یہ بھی تاریخ ہے — کہ ساتھ ان کے غمگیں گئی ریختی

۱۲۵۱ھ / ۱۸۳۵ء

غمگین کا ترجمہ کریم الدین[4]، نساخ[5]، شیفتہ[6] اور عبدالحیٔ صفا[7] نے بھی دیا ہے لیکن کوئی نئی یا خاص بات نہیں لکھی۔ سید فتح علی گردیزی کے تذکرہ ریختہ گویاں میں اٹھانوے شعرا کا ذکر ہے لیکن غمگین کا ذکر نہیں[8]۔ مولانا محمد حسین آزاد نے موخرالذکر کا شمار استادوں میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ نواب الٰہی بخش خاں معروف نے بھی غمگین سے مشورۂ سخن کیا تھا[9]۔

۱؎ مجالسِ رنگین: نظامی پریس لکھنؤ ص ۱۰
۲؎ مجالسِ رنگین ص ۶۲
۳؎ مخزن الاسرار قلمی: غمگین اکادمی گوالیار
۴؎ تذکرۂ کریم الدین: ص ۱۹۰ و ۱۹۱ (طبقہ دوم) طبع دہلی۔ ۱۸۴۸ء
۵؎ نساخ: سخن شعرا، ص ۳۵۲، مطبع نول کشور
۶؎ شیفتہ: گلشنِ بے خار، ص ۱۴۴، مطبع نول کشور
۷؎ صفا: شمیم سخن، ص ۱۷۷، مطبع امداد الہند، مراد آباد
۸؎ تذکرہ ریختہ گویان، مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق، مطبوعہ اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء
۹؎ مقدمہ دیوانِ ذوق، محمد حسین آزاد،

غالبؔ کا سکّہ شعر

۱۸۵۷ء کی بغاوت میں مرزا غالبؔ پر سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ وہ "باغیوں" سے اخلاص رکھتے تھے اور انھوں نے بہادر شاہ کی شہنشاہی کے اعلان پر، جو ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو ہوا، ایک سکّہ شعر بھی کہا تھا۔ اس کا ذکر انھوں نے تفصیل سے ایک خط میں کیا ہے جو حسین مرزا کے نام ہے اور ۱۸ر جون ۱۸۵۹ء کا لکھا ہوا ہے:

"اب میرا دکھ سنو۔ بھاگا نہیں، پکڑا نہیں گیا، دفترِ قلعہ سے کوئی میرا کاغذ نہیں، کسی طرح کی بے وفائی و نمک حرامی کا دھبّا مجھ کو نہیں لگا۔ یہاں ایک اخبار جو گوری شنکر یا گوری دیال یا کوئی اور غدر کے دنوں میں بھیجتا تھا، اس میں ایک خبر اخبار نویس نے یہ بھی لکھی کہ فلانی تاریخ اسد اللہ خاں غالبؔ نے یہ سکّہ کہہ کر گزرانا ؎

بہ زر زد سکّۂ کشور ستانی　　سراج الدین بہادر شاہ ثانی

مجھ سے عند الملاقات صاحب کمشنر نے پوچھا کہ یہ کیا لکھتا ہے۔ میں نے کہا کہ غلط لکھتا ہے۔ بادشاہ شاعر، بادشاہ کے بیٹے شاعر، بادشاہ کے نوکر شاعر،

خدا جانے کس نے کہا۔ اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا۔ اگر میں نے کہہ کر گزرانا ہوتا تو دفتر سے وہ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا گزرتا اور آپ جانیے حکیم احسن اللہ خاں سے پوچھیے۔ اس وقت تو چپ ہو رہا۔ ا بجو اس کی بدلی ہوئی تو جانے سے دو ہفتے پہلے ایک فارسی روبکاری لکھوا آیا کہ یہ جو اسد اللہ خاں فارسی کے علم میں یکتا مشہور رہے، اس سے کام نہیں نکلتا۔ یہ شخص بادشاہ کا نوکر تھا اور اس کا سکہ لکھا، ہمارے نزدیک پنشن لے پانے کا مستحق نہیں ہے....

یوسف مرزا کو دعا پہنچے۔ بھائی یہاں منشی میر احمد حسین ولد روشن علی خاں نے مجھ سے کہا کہ حضرت! جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے ہیں تو میں مرشد آباد میں تھا، وہاں میں نے یہ سکہ سنا تھا، ان کے کہنے سے مجھے یاد آیا کہ مولوی محمد باقر نے خبر وفات اکبر شاہ و جلوس بہادر شاہ چھاپی تھی؛ وہاں اس سکہ کا گزرنا ذوق کی طرف سے چھاپا تھا۔ اور جلوس بہادر شاہ اکتوبر کے مہینے ۱۸۳۷ء یا ۱۸۳۸ء میں واقع ہوا ہے۔ بعض صاحب اخبار جمع کر رکھتے ہیں، اگر وہاں کہیں اس کا پتا پاؤ گے اور وہ اخبار اصل بجنسہ مجھ کو بھجواؤ گے تو بڑا کام کرو گے[1]۔"

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) جو سکہ غالب سے منسوب کیا گیا وہ یہ ہے ؎

بہ زر زد سکۂ کشور ستانی   سراج الدین بہادر شاہ ثانی

(۲) غالب اس کی تصنیف کے منکر ہیں اور اسے ذوق کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

(۳) غالب کے خیال میں یہ سکہ بہادر شاہ کی تخت نشینی کے وقت ۱۸۳۷ء یا ۱۸۳۸ء میں کہا گیا تھا، یہ مرشد آباد تک مشہور تھا اور دہلی اُردو اخبار میں چھپ چکا تھا۔

اسی لیے غالب کو اس اخبار کی تلاش تھی۔ چودھری عبدالغفور سرور کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

---

[1] مملوکہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی۔ عکس مشمول علی گڑھ میگزین غالب نمبر ۴۹-۱۹۴۸ء

"جناب چودھری صاحب آج کا میرا خط کاسۂ گدائی ہے، یعنی تم سے کچھ مانگتا ہوں. تفصیل یہ کہ مولوی باقر دہلوی کے مطبع میں سے ایک اخبار ہر مہینے میں چار بار نکلا کرتا ہے، مسمیٰ بہ دہلی اردو اخبار۔ بعض اشخاص سنین ماضیہ کے اخبار جمع کر رکھا کرتے ہیں۔ اگر احیاناً آپ کے یا کسی آپ کے دوست کے ہاں جمع ہوتے چلے آئے ہوں تو اکتوبر ۱۸۳۷ء سے دو چار مہینے کے آگے کے اوراق دیکھے جائیں جس میں بہادر شاہ کی تخت نشینی کا ذکر اور میاں ذوق کے دو سکّے ان کے نام کے کہہ کر نذر کرنے کا ذکر مندرج ہو بے تکلف وہ اخبار چھاپے کا اصل بجنسہ میرے پاس بھیج دیجئے۔"[1]

چودھری عبدالغفور اس پرچے کے حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ ان کو لکھتے ہیں:

"آپ کی سعی اور اپنی ناکامی پہلے سے میرے دلنشیں اور خاطر نشاں ہے جیسا کہ کوئی استاد کہتا ہے ؎

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

وہ اخبار نہ کہیں سے ہاتھ آیا اور نہ آئے گا۔ میں اپنے خدا سے امیدوار ہوں کہ میرا کام بغیر اس کے نکل جائے گا۔"[2]

اگلے خط میں پھر اسی کا ذکر ہے اور اس کا افسوس ہے کہ یہ الزام کسی طرح دور نہ ہوسکا:

"سکّے کا دار تو مجھ پر ایسا چلا جیسے کوئی چھرا یا کوئی گراب، کس سے کہوں، کس کو گواہ لاؤں۔ یہ دونوں سکّے ایک وقت میں کہے گئے ہیں، یعنی جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے تو ذوق نے یہ دو سکّے کہہ کر گزرانے۔ بادشاہ نے پسند کیے۔ مولوی محمد باقر جو ذوق کے معتقدین میں تھے، انھوں نے دلی اُردو اخبار میں یہ دونوں سکّے چھاپے۔ اس کے علاوہ اب وہ لوگ موجود ہیں کہ جنھوں نے اس زمانے میں مرشد آباد اور کلکتہ میں یہ سکّے سُنے ہیں اور ان کو یاد ہیں۔

---

[1] اُردوئے معلیٰ، مطبوعہ ۱۸۹۹ء، ص ۱۰۰ و ۱۰۱۔

[2] ایضاً، ص ۱۰۱ و ۱۰۲ (مطبع مجتبائی)۔

اب یہ دونوں سکّے سرکار کے نزدیک میرے کہے ہوئے اور گزرانے ہوئے ثابت ہوئے۔ میں نے ہر چند قلمرو ہند میں دلی اُردو اخبار کا پرچہ ڈھونڈھا، کہیں ہاتھ نہ آیا۔ یہ دھبہ مجھ پر رہا۔ پنشن بھی گئی اور وہ ریاست کا نام و نشان خلعت و دربار بھی مٹا۔ خیر جو کچھ ہوا چونکہ موافقِ رضائے الٰہی ہے، اس کا گلہ کیا ؎

چوں جنبشِ سپہر بہ فرمانِ داور است
بیداد نبود آنچہ بما آسماں دہد[1]"

یوسف مرزا کو لکھتے ہیں:

"وہ دہلی اردو اخبار کا پرچہ اگر مل جائے تو بہت مفید مطلب ہے، ورنہ خیر، کچھ محلِ خوف و خطر نہیں ہے۔ حکام صدر ایسی باتوں پر نظر نہ کریں گے۔ میں نے سکّہ کہا نہیں اور اگر کہا تو اپنی جان و حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں۔ اور اگر گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکۂ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے۔ سبحان اللہ، گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرعے معاف نہ ہوں[2]"

سوال یہ ہے کہ غالب کے وہ "دو مصرع" کون سے تھے؟ تھے بھی یا نہیں؟ ہمارا خیال ہے کہ جو سکّے غالب کے نام سے مشہور ہوئے وہ درحقیقت ان کے نہیں تھے اور اس معاملے میں ان کا اضطراب بجا تھا۔ لیکن انھوں نے سکّہ بھی کہا تھا اور قصیدہ بھی گزرانا تھا، اس طرح "باغیوں" سے اخلاص کی بات بالکل نظرانداز کرنے کے قابل بھی نہیں ہے۔ اس کے اعادے میں بھی مضائقہ نہیں کہ جو سکّہ میں نے دریافت کیا ہے وہ غالب کے انکار کی بنیاد نہیں ہے اور نہ وہ ان کے کسی خط میں معرضِ بحث میں آیا ہے۔

معین الدین حسن خاں نے خدنگِ غدر[3] میں لکھا ہے کہ لکھنؤ سے مرزا عباس نذر

---

[1] اُردوئے معلّٰی، مطبوعہ ۱۸۹۹ء، ص ۱۰۳، ۱۰۴

[2] خطوط غالب مرتبہ مولوی مہیش پرشاد، ص ۱۵۶

[3] عکس مملوکہ راقم۔ یہ کتاب شعبۂ اُردو، دہلی یونی ورسٹی کی طرف سے شائع ہو چکی ہے

لائے، جس میں بادشاہ کے نام کی اشرفیاں تھیں اور جن پر یہ شعر کھدا ہوا تھا :

بہ زر زد سکۂ نصرت طرازی　　　　سراج الدین بہادر شاہ غازی

یہاں ایک جملۂ معترضہ ضروری ہے، مٹکاف نے خدنگِ غدر کے انگریزی ترجمے میں سورج الدین[1] لکھا ہے، اس کے علاوہ اس میں ترجمے کی بے شمار غلطیاں ہیں، خواجہ حسن نظامی نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کروایا ہے[2] اور اصل متن نہیں دیکھا۔ مٹکاف کا ترجمہ غلط اور خواجہ حسن نظامی مرحوم کا غلط در غلط ہے۔

ممکن ہے یہ سکّہ (بہ زر زد سکہ کشورستانی ؛ سراج الدین بہادر شاہ ثانی) بہادر شاہ کی تخت نشینی (۱۸۳۷ء) کے وقت کا ہو اور بعد میں "کشورستانی) کے بجائے نصرت طرازی اور "ثانی" کے بجائے غازی کے الفاظ سنہ ستاون کی جہدِ آزادی کے پیشِ نظر بدل دیے گئے ہوں۔ اس میں اور غالب کے نقل کردہ سکّے میں اصل فرق یہی ہے، اس کا مصنف کون ہے؟ یہ کہنا مشکل ہے، لیکن جیون لال معین الدین حسن خاں دونوں نے اسے ایک ہی طرح لکھا ہے اور کسی نے اسے غالب سے منسوب نہیں کیا، پوری خدنگ غدر میں صرف ایک جگہ غالب کا ذکر ہے، وہ بھی ان کے بھائی کے ذیل میں ہنگامۂ جرنیلی کے سلسلے میں لکھتے ہیں :

"محلہ کھڑکی فراش خانہ میں مولوی فریدالدین صبح کی نماز پڑھتے ہوئے مسجد میں مارے گئے، حکیم رضی الدین خاں و حکیم احمد حسین خاں بھی اسی طرح معہ اپنے قاتلوں کے ملک عدم کو دست و گریبان روانہ ہوئے، مرزا یوسف برادرِ خورد اسداللہ خاں غالب کہ قدیم سے مجنون تھے، حالتِ جنون میں گھر سے باہر نکل کے ٹہلنے لگے، وہ بھی مارے گئے اور کئی آدمی آبر (و) دار، نامی اس ہنگامۂ جرنیلی میں معرضِ قتل میں آ گئے"[3]

---

[1] TWO NATIVE NARRATIVES OF THE MUTINY IN DELHI TRANSLATED BY C.T. METCALFE, 1898, PAGE 69.

[2] غدر کی صبح و شام، مطبوعہ ہمدرد پریس دہلی (۱۹۲۶ء) مرتبہ مولوی ضیاء الدین برنی

[3] خدنگ غدر مخطوطہ بقلم مصنف، ورق ۴۷، الف۔ عکس مملوکہ راقم۔

منٹکاف نے جیون لال کے روزنامچے کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا ہے، اس میں بھی بہت سی فاحش غلطیاں ہیں، اس ترجمے میں غالب کا سکّہ ندارد ہے لیکن اصل روزنامچے میں موجود ہے[1]

منشی جیون لال کے الفاظ یہ ہیں:

"انیسویں مئی ۱۸۵۷ء؛

دربار شاہی منعقد ہوا، مولوی ظہور علی تھانہ دار نے حاضر ہوکر ایک سکّۂ جلوس دربابت تخت نشینی حضور گزرانا۔ سکّۂ شعر:

سکہ زد بر سیم و زر در ہند شاہ دیں پناہ ظلِّ سبحانی سراج الدین بہادر شاہ (کذا)

اس پر اور شاعروں نے بھی سکّے کہے۔ سکّۂ شعر:

سکۂ صاحبقرانی زد بتائیدِ الٰہ سایۂ یزداں سراج الدین بہادر شاہ (کذا)

(ورق ۳۸ ب) دیگر سکۂ شعر:

سکۂ صاحبقرانی زد بتائیدِ الٰہ ظلِّ سبحانی سراج الدین بہادر شاہ

دیگر سکۂ شعر:

بزر زد سکۂ نصرت طرازی سراج الدیں بہادر شاہ غازی

دیگر سکۂ شعر۔ مرزا نوشہ ؎

بر زرِ آفتاب و نقرۂ ماہ سکہ زد در جہاں بہادر شاہ[2]"

منٹکاف نے اس عبارت کا ترجمہ کہ "مولوی ظہور علی تھانہ دار نے حاضر ہوکر ایک سکۂ جلوس دربابت تخت نشینیٔ حضور گزرانا۔ الخ" اس طرح کیا ہے[3] اصل کے ساتھ بقول اطالیوں کے غداری ہے۔

---

[1] جیون لال: روزنامچہ اُردو قلمی عکس مملوکہ راقم۔ [2] روزنامچہ منشی جیون لال اصل مسودہ مملوکہ مٹکاف ورق ۳۸ الف و ب عکس مملوکہ راقم۔ [3] مٹکاف نے یہ ظہور علی کی ریشہ لگائی ہے۔ "سکہ جلوس" اور "دیگر سکۂ شعر" کا ترجمہ مضحکہ خیز ہے، اس سے سارا مفہوم بدل گیا ہے (مٹکاف کا ترجمہ ص ۹۶) خواجہ حسن نظامی نے لکھا: "مولوی علی تھانہ دار بھی حاضر تھے اور انھوں نے نذر کے طور پر چند اشرفیاں پیش کیں۔ سکّوں پر یہ الفاظ کندہ تھے۔ سکہ زد بر سیم و زر الخ۔ دوسری جانب حسبِ ذیل عبارت درج تھی: سکہ صاحب قرانی الخ" ملاحظہ ہو غدر کی صبح و شام ص ۱۱۳۔

MOLVI JAJJAR ALI (۲) THANADAR ATTENDED AND PRESENTED A SICCA OF GOLD MOHUR AS TRIBUTE MONEY. ON THE COINS WEREINSCRIBEI ON THE REVERSE:

سکہ زد بر سیم و زر الخ

سکہ صاحبقرانی زد الخ

منشی جیون لال کی روش غالب کے ساتھ معاندانہ نہیں ہے۔ دوسرے یہ شعر ؎

بزرِ آفتاب و نقرۂ ماہ   سکہ زد در جہاں بہادر شاہ

خود پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس کا مصنف غالب کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اب تک مختلف شاعروں کے سات سکے سامنے آئے ہیں لیکن اس "قدِ دل کش" کے ساتھ کوئی بھی نہیں آیا۔

غالب نے ایک قصیدہ بھی اس زمانے میں فتح آگرہ کی خوشی کے موقع پر پیش کیا تھا، آگرے کے اخبار عالم تاب میں لکھا ہے کہ "مرزا نوشہ اور مکرم علی خاں نے ۱۳ر جولائی ۱۸۵۷ء کے دن بہادر شاہ کی تعریف میں قصیدے پڑھے تھے۔" اس کی بھی تائید منشی جیون لال کے روزنامچے سے ہوتی ہے۔ ۱۳ر جولائی ۱۸۵۷ء کے ذیل میں لکھا ہے:

(فتح آگرہ کے مژدے سے سب بادشاہ و اہلِ قلعہ خوش تھے) "مرزا نوشہ اور مکرم علی خاں نے ایک قصیدہ من تصنیف خود ہا بادشاہ کی مدح میں پڑھے۔[1]"

— — —

[1] روزنامچہ جیون لال قلمی، ورق ۹۱ الف۔ نیز مولانا ابوالکلام آزاد: نقشِ آزاد، طبع لاہور، ص ۲۰۴

غالب کے ایک شاگرد ـــــــ مولانا بیدل

مراد ہے مولانا عبدالسمیع بیدل سے۔ تلامذۂ غالب میں ان کا سرسری ذکر ہے۔ اس ترجمہ میں نہ تو ان کی پوری تصانیف کا احاطہ کیا گیا ہے اور نہ ان کی کوئی غزل درج کی گئی ہے[1] حالاں کہ غالب سے ان کے معنوی تعلق کا اصلی سرچشمہ یہی ہے۔ تلامذۂ غالب کی یہ بات بھی قرینِ صحت نہیں کہ بیدل کی "نورِ ایمان" میں "مسائلِ دینی" نظم کیے گئے ہیں[2] (یہ دراصل نعت شریف میں ایک رسالہ ہے جس کا دیباچہ نثر میں اور اصل رسالہ نظم میں ہے) یہ اطلاع بھی صحیح نہیں کہ نور ایمان کے دیباچے میں عبدالسمیع بیدل کے یہ اشعار "دوستو ہے دار فانی چند روز الخ" درج کیے گئے ہیں[3] ہمارے سامنے نورِ ایمان کا وہ نسخہ ہے جو شرف المطابع میرٹھ سے شائع ہوا تھا۔ اس میں یہ اشعار کہیں بھی موجود نہیں[4]۔ اور دیباچہ تو از اوّل تا آخر نثر میں ہے۔ اس میں ایک مصرع بھی نہیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہو سکا ہے اس کا کوئی دوسرا ایڈیشن بھی ترمیم کے ساتھ شائع نہیں ہوا۔ ان وجوہ سے گمان

[1] تلامذۂ غالب (مالک رام) ص ۵۲ [2] ایضاً [3] ایضاً
[4] نور ایمان مطبوعہ شرف المطابع، میرٹھ ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۴ء)

ہوتا ہے کہ صاحب تلامذۂ غالب نے نورِ ایمان کو ملاحظہ نہیں فرمایا۔ کسی اور ذریعے سے معلومات اخذ کی ہیں، ورنہ وہ اس کے مندرجات سے ہمیں صحیح طور پر مطلع فرماتے اور اس کے صفحہ، مطبع اور ایڈیشن کسی چیز کا تو حوالہ دیتے۔ اس کے علاوہ مولف موصوف "عبدالسمیع بیدل کی کلھم دو کتابوں کو" موجود" بتاتے ہیں، حالاں کہ اس وقت ان کی دس تصانیف ہمارے سامنے موجود ہیں جو محب مکرم بھیا شمس الدین صاحب رئیس میرٹھ کی مہربانی سے حاصل ہوئی ہیں۔ موخر الذکر مخدومی خان بہادر شیخ بشیر الدین صاحب مرحوم و مغفور کے چھوٹے صاحبزادے ہیں اور خان بہادر صاحبؒ، بیدل کے ارشد تلامذہ میں سے تھے ــ گویا شاگردی کے لحاظ سے غالب کے پوتے تھے۔

نورِ ایمان کا دیباچہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

"عبدالسمیع بیدل اور اللہ رسول کی صفات! وہی مثل ہے چھوٹا منھ بڑی بات۔ اس زبان کثیف کو اُس نام لطیف سے کیا مناسبت۔ خاک کو عالم پاک سے کیا نسبت۔ بھلا جس کا بال بال خطاؤں میں بھرا ہوا ہو۔ اس سے یہ پاک عمل سراسر صواب کیونکر ادا ہوا۔ لیکن کیا کیجیے چین نہیں پڑتا کہ یہ نام نہ لیجیے۔ کبھی دل اور زبان کو اس نام سے تجلی دیا جاتا ہے کہ لا الٰہ الا اللہ اور کبھی روح رواں کو اس نام سے تازہ کیا جاتا ہے کہ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللہِ۔ پھر پھر کر یہی دو نام۔ ان ہی دو کی اطاعت سے اہلِ ایمان کا حسن انجام[1]۔"

مولانا بیدل ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۳ء) میں شہر "جاں آسائے راحت افزائے دہلی" میں پہنچے[2] اور علوم معقول و منقول مفتی صدر الدین آزردہ اور دیگر اکابر علمائے دین سے حاصل کیے[3]۔ خود لکھتے ہیں:

"اُن ایام میں بہ اقتضائے عنفوانِ شباب دل میں یہ بھی ایک موج آئی کہ جناب نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں غالب عرف مرزا نوشہ دہلوی سے شعر میں اصلاح یعنی ٹھہرائی۔ تب البتہ عاشقی و معشوقی کے مضامین موجبہ رسمیہ ابنائے زماں کی طرز پر لکھتا

[1] نورِ ایمان۔ ص ۲ [2] نورِ ایمان۔ ص ۳۔ نیز طرازِ سخن۔ محمود پریس۔ میرٹھ۔ ص ۳ [3] نورِ ایمان۔ ص ۳

تھا لیکن ان مضامین پر دل دادہ و فریفتہ نہ تھا۔ اسی وجہ سے ان کو بحفاظت تمام لکھ لکھ کر محفوظ رکھتا نہ تھا۔ چنانچہ اکثر غزلیں ان وقتوں کی لکھی ہوئی ایسی منتشر ہو گئیں کہ ان کا کہیں پتا نہیں مگر ایک قدر دانِ سخن نے (مراد خان بہادر شیخ بشیر الدین مرحوم) ان میں سے کچھ اشعار بمشقت فراہم کیے ہیں[1]۔"

مولانا عبدالسمیع بیدل کا یہ مجموعہ طرازِ سخن کے نام سے ۱۸۹۶ء میں محمود پریس محلہ اندرکوٹ میرٹھ سے شائع ہوا جو "غزلیات وعیدیات و دیگر منظومات" پر مشتمل ہے اور جس کے شروع میں مذکورۂ صدر" صاحب زادہ بشیر الدین احمد صاحب خلف خان بہادر حاجی عبدالکریم صاحب سی۔ آئی۔ ای میرٹھ" کا دیباچہ بھی شامل ہے[2]۔

مولانا عبدالسمیع بیدل" رام پور ضلع سہارن پور" کے رہنے والے تھے اور ان کا سلسلۂ نسب" حضرت ابی ایوب خزرجی انصاری صحابی رضی اللہ عنہ پر منتہی ہو کر نصر بن کنانہ سے جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد میں ہیں، جا ملتا ہے[3]۔"

شیخ بشیر الدین صاحب مرحوم کا بیان ہے کہ بیدل نے ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۳ء) میں مرزا غالب سے تلمذ حاصل کیا[4] لیکن" مشاغل باطنی" میں اتنا انہماک تھا کہ کچھ عرصے کے بعد عاشقانہ مضامین کے بجائے" نعت گوئی کی جانب توجہ فرمائی۔ ۔ ۔ چنانچہ آپ کی مصنفہ کتابیں مثل نور ایمان و سلسبیل و راحت القلوب و بہار جنت و مظہر الحق وغیرہ مشہور آفاق ہیں[5]۔"

دیباچہ نگار موصوف نے لکھا ہے کہ:

"حضرت استادی کی توجہ ان جواہر نایاب (عاشقانہ کلام) کے مجتمع کرنے کی جانب مائل نہ تھی۔ بڑی دقت کے ساتھ میں نے جہاں سے جس قدر مل سکا فراہم کیا اور جز جزداں بنا کر رکھتا گیا۔ دہلی کی غزلوں کا مجموعہ بالکل نہ مل سکا اور ایام غدر دہلی کے بعد جو غزلیں لکھی

[1] نور ایمان، ص ۳۔ [2] طرازِ سخن (محمود پریس میرٹھ) ص ۲ تا ۴۔ [3] طراز سخن، ص ۲۔ [4] طراز سخن، ص ۳۔
[5] طراز سخن، ص ۳۔ بھتیجا شمس الدین کا بیان ہے کہ نعت گوئی کی طرف توجہ حضرت امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ سے بیعت کے بعد ہوئی۔

گئیں، وہ بیاض چوری گئی [1]

خان بہادر شیخ بشیر الدین صاحب مرحوم نے جو کلام جمع کیا ہے وہ حضرت بیدل کی زندگی میں۔ اور اس مجموعے کے تیار کرنے میں اُن لوگوں سے خاص طور پر مدد لی ہے جن کو ان کا کلام یاد تھا۔ جو غزلیں ناتمام ہیں ان کو اسی طرح رہنے دیا ہے۔

طرازِ سخن ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ دیباچے میں اس کا اعتراف ہے کہ اگرچہ موجودہ اُردو شاعری "جدید تعلیم یافتہ طبائع" کے لیے "لطف انگیز" ہے لیکن بیدل کا کلام "عاشقانہ مضامین اور صنائع بدائع" دونوں اعتبار سے "سر آنکھوں پر جگہ دینے کے" لائق ہے [2]

دیوان کی پہلی غزل کا مطلع ہے ؎

بنایا عشق نے دل آئینہ اسرار جاناں کا
مرا حالِ پریشاں عکس ہے زلفِ پریشاں کا

ذیل میں بیدل کے منتخب اشعار "طرازِ سخن" سے دیے جاتے ہیں:

آسماں راہ پر نہیں آتا — باز یہ فتنہ گر نہیں آتا
کوئی حسرت نہیں نکلتی ہائے — مدعا کوئی بر نہیں آتا
ہم بھی پتھر کا دل بنالیں گے — گر وہ سنگیں جگر نہیں آتا

موتی بھر لائی ہے یہ چاندی کی کشتی میں بہار
یا چنبیلی پر پڑی ہے اوس دانہ دانہ رات
اس کے رُخ سے صبح کا دھوکا نہ کھا مرغِ سحر
دیکھ زلفوں کو ابھی باقی ہے اے دیوانہ رات
کٹ کے سر اپنا گرا تو پائے قاتل پر گرا
تھا شہادت کے لیے یہ سجدۂ شکرانہ رات

[1] طرازِ سخن۔ ص ۴۔ [2] ایضاً۔ ص ۳و۴۔

رات بیدلؔ نے غزل اک اور بھی لکھی ہے گرم
شمع تھی بے تاب جس پر صورتِ پروانہ رات

غم نہیں ہے کہ اضطراب نہیں — جان پر میری کیا عذاب نہیں
دل دیا حق نے وہ کہ ہے بیتاب — آنکھ وہ دی کہ جس کو خواب نہیں
یہاں تو یہ نوبت کہ سانس گنتے ہیں — وہاں وہ غفلت کہ کچھ حساب نہیں
اپنے عاشق کی بے کلی مت پوچھ — دن کو آرام، شب کو خواب نہیں
شعلہ رو تیری گرم خوئی سے — کون سا دل ہے جو کباب نہیں
مختصر ہے یہ حال بیدلؔ کا
تن میں طاقت، جگر میں تاب نہیں

جب اُس بُت کی ترچھی نظر دیکھتے ہیں — زمانہ کو زیر و زبر دیکھتے ہیں
وہ آویں نہ آویں، مگر منتیں ہم — جو اپنی سی ہوتی ہیں کر دیکھتے ہیں
وہ دیکھے، نہ دیکھے مگر ہم تو بیدلؔ — اسی کو بس آٹھوں پہر دیکھتے ہیں

بیدلؔ میں کبھی کوچۂ دلبر میں نہ جاتا — لایا مجھے میرا دلِ بے تاب اِدھر کو

گر مانگ لیا مانگ نے دل اور جگر کو — چوٹی نے لیا گوندھ مرے تارِ نظر کو
وہ آئے، یہ آئے، ابھی غائب ہیں نظر سے — ظالم تری شوخی نے کیا مات شرر کو
کچھ شوق نہیں شعر و غزل سے مجھے بیدلؔ — لے آتی ہے فرمائشِ احباب ادھر کو

دل چاک چاک ہو گیا تیغِ ادا کے ساتھ — ٹکڑے جگر کے اوڑ گئے مشقِ جفا کے ساتھ
گر وصل بھی ہوا نہ ہوئیں بے حجابیاں — وہ حیلہ گر اولجھ گیا بندِ قبا کے ساتھ

جب باغ باغ ہو کے وہ ہنستا ہے گلبدن — جھڑتے ہیں پھول خندۂ دنداں نما کے ساتھ
گزرا نہ میرے قتل سے سب سر پٹک مرے — منت کے ساتھ، عجز کے ساتھ، التجا کے ساتھ
آجائے تو، تو جان پھر آجائے جسم میں — مر کر بھی جی اوٹھوں تیری آوازِ پا کے ساتھ

دل کی عبث تلاش ہے پہلو میں دل کہاں
بیدل تمھارا دل تو گیا دل رُبا کے ساتھ

اوٹھاتے ہیں وہ رُخ سے یوں نقاب آہستہ آہستہ
چھٹے جیسے گہن سے ماہتاب آہستہ آہستہ
نہیں کچھ ایک دو ساغر کہ خم کے خم اولٹ دیں گے
پلائے جا ہمیں ساقی شراب آہستہ آہستہ

طرازِ سخن میں کچھ عیدیاں، پہیلیاں، قطعات تاریخ اور اشعار فارسی بھی شامل ہیں۔

بیدل کی تصانیف جو ہمیں دستیاب ہو سکیں، ان کی تفصیل یہ ہے :

۱۔ نورِ ایمان۔ نعت شریف اور استحسانِ محفل میلاد میں۔ دیباچہ نثر میں ہے، باقی منظوم۔ مطبوعہ شرف المطابع میرٹھ۔ ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۴ء) تعداد صفحات ۷۲۔
۲۔ طرازِ سخن۔ (دیوان) محمود پریس میرٹھ۔ ۱۸۹۶ء۔ تعداد صفحات ۴۸۔
۳۔ سلسبیل فی مولد ہادی السبیل۔ قصیدہ نعتیہ۔ شرف المطابع میرٹھ۔ ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۴ء) تعداد صفحات ۸

نمونہ :

اوّل میں وہ ہی ایک تھا، مولیٰ و والی ایک تھا
وہ ذی تجلّی ایک تھا، وہ سرِّ معنی ایک تھا
وہ گنجِ ہستی ایک تھا، وہ کنزِ مخفی ایک تھا
پیدا نہ کوئی ایک تھا، جز ذاتِ ربِّ ذو المنن

کب تھی یہ پھولوں کی مہک، کب تھی یہ کلیوں کی چٹک
نسریں میں کب تھی یہ چمک، چمپا میں کب تھی یہ جھلک
لالہ میں کب تھی یہ دمک، کانٹے سے تھے گل برگ تک
معدوم تھے سب یک بیک، گل تھا نہ گلبن نے چمن

یہ قصیدہ بڑے والہانہ ذوق وشوق سے لکھا ہے اور اس میں قادر الکلامی کا پورا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔

۴۔ مثنوی نعتیہ جوہرِ لطیف فی میلاد الحنیف۔ مطبع قاسمی میرٹھ ۱۳۲۷ھ۔ تعداد صفحات ۱۲۔

۵۔ حمدِ باری۔ بیانِ لغات میں منظوم رسالہ۔ مطبع ہاشمی میرٹھ ۱۳۱۳ھ۔ تعداد صفحات ۳۲۔ ابتدا:

سیل ہے رو اور نالا اسے دبیر
ندی ارغاب اور تالاب آب گیر

۶۔ مظہر الحق۔ ارکانِ اسلام کے بیان میں منظوم رسالہ۔ تعداد صفحات ۲۲ اور تعداد اشعار ۲۹۰۔ مطبع نامعلوم۔

۷۔ بہارِ جنّت۔ (میلاد شریف) نثر اور نظم دونوں میں۔ مطبعِ محمدی کانپور ۱۳۱۰ھ۔ تعداد صفحات ۷۲۔

۸۔ راحۃ القلوب (نثر)۔ ذکرِ رسولؐ اور فضائلِ محفلِ میلاد میں۔ مطبعِ مجتبائی دہلی ۱۳۱۰ھ۔ تعداد صفحات ۹۲۔

۹۔ دافع الاوہام فی محفل خیر الانام۔ مولود شریف کے جواز اور مولانا اسمٰعیل شہید کی تردید میں ۳۸ صفحے کا رسالہ جو نثر اور نظم میں ملا کر لکھا گیا ہے۔ زیادہ تر دلائل شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی اور حضرت مجدد الف ثانی ہی سے دیے گئے ہیں۔ مطبوعہ مطبع چشمۂ فیض ۱۲۹۶ھ

۱۰۔ انوارِ ساطعہ دربیان مولود وفاتحہ۔ "وہابی" علما کے اعتراضات کا رد، سوال و جواب کی شکل میں۔ مطبوعہ مطبع دار العلوم میرٹھ ۱۳۰۲ھ۔ تعداد صفحات ۲۲۰۔

عبدالسمیع بیدؔل شیخ الٰہی بخش رئیس میرٹھ کے یہاں بہ حیثیت معلم بارہ روپے ماہوار اور کھانے پر ملازم تھے۔ وہیں ۱۹۰۱ء میں انتقال فرمایا اور قبرستان موسوم شاہ ولایت میں دفن ہوئے۔ ان کے ایک صاحب زادے حکیم میاں محمد مرحوم، حکیم عبدالمجید خاں دہلوی کے شاگرد اور میرٹھ کے مشہور طبیب تھے۔ معاصرینِ بیدؔل میں بیاؔن یزدانی اور شوکت میرٹھی معروف ہیں۔ آمیر مینائی سے بھی ان کے تعلقات تھے۔ بھتیا شمس الدین کا بیان ہے کہ آمیر کے خطوط بیدؔل کے نام جمع کیے گئے تھے جو سوءِ اتفاق سے ضائع ہو گئے۔

معرکۂ غالب و حامیانِ قتیل

ایرانی ہندی نزاع کی روشنی میں

علاؤالدین خلجی کا زمانہ تاریخ ہند کا ایک درخشاں باب ہے۔ منگولوں کی سفاکی و بے رحمی اور خلجیوں کی قدردانی اور علم پروری کی وجہ سے ہندوستان علم و فضل کا مرکز بن گیا تھا اور ایشیا کی منفرد ہستیاں یہیں آکر جمع ہوگئی تھیں۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے علاؤالدین خلجی کے دربار کے فقرا، علما، فضلا اور شعرا کی طویل فہرست دی ہے۔ شبلی نے ان میں سے صرف ۶۰ اکابر کا ذکر کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے:

"لیکن امیر خسرو کے آفتاب کمال نے ان تمام ستاروں کو بے نور کر دیا تھا .... اس وسیع مرقع میں صرف امیر موصوف کی تصویر نمایاں نظر آتی ہے۔"[1]

ادبیات میں ملکی اور غیر ملکی سوال کی ابتدا اور ایرانی ہندی نزاع کا آغاز بھی تقریباً اسی زمانے سے ہوتا ہے۔ خسرو کی جامعیت اور اس کی شاعری اور زباں دانی کا اعتراف تقریباً تمام ناقدین نے کیا ہے۔ دولت شاہ سمرقندی لکھتا ہے:

---

[1] شعرالعجم، ج ۲، ص ۹۶

"درحق او مرتبہ سخن گزاری ختم تمام است[1]۔"

خسرو کو تمام اکابر نے "طوطیِ ہند" مانا ہے:

عرفی ؎ بہ روحِ خسرو ازیں پارسی شکر دارم
که کام طوطی ہندوستاں شود شیریں

تاہم بعض شعرا قومی تعصب کو نہیں چھپا سکے۔ عبید جو خسرو کا معاصر ہے لکھتا ہے:

غلط افتاد خسرو راز خامی
کہ سکبا پخت در دیگ نظامی

اس تعصب کی ایک وجہ یہ ہے کہ امیر خسرو نے بعض محاورے ایسے باندھے ہیں جو اہلِ زبان کے یہاں نہیں ملتے۔ بعد میں یہ مسئلہ "استعمال ہند" بہت بڑا نزاعی سوال بن گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زبان کبھی بھی مقامی اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ متاخرین میں خانِ آرزو نے بھی اس استعمالِ ہند کو جائز سمجھا۔

فیضی اور عرفی کے اختلافات اور نوک جھونک کی بھی ایک وجہ یہی ایرانی ہندی نزاع تھی۔ خافی خان نے ایک لطیفہ لکھا ہے کہ فیضی کو کتوں کا بڑا شوق تھا۔ سگ بچوں کے سونے کے پٹے پڑے ہوئے تھے۔ عرفی نے فیضی سے پوچھا:

"مخدوم زادہا بہ چہ اسم موسوم اند"
فیضی نے کہا: "بہ اسم عرفی"
عرفی نے برجستہ کہا: "مبارک باشد[2]"

ابوالفضل بھی عرفی سے جلتا تھا۔ اکبر نامے میں لکھتا ہے:

"درے از سخن سرائی بر وکشودہ بودند۔ درخور نہ گریست و برپا ستانیان زبانِ طعن کشود۔ غنچۂ استعداد نشگفتہ پژمرد"

اکبر کے زمانے سے شاید ہی کوئی ایرانی شاعر ایسا ہو جس کا کلام اعتراضات کا

---

[1] تذکرۃ الشعرا (لاہور) ص ۱۵۰۔
[2] لیکن فیضی نے اپنے مکاتیب میں عرفی کی بڑی تعریف کی ہے۔

ہدف نہ بنا ہو۔ عرفی، ظہوری، قدسی، زلالی سب ہی اس تیغِ ہندی کے زخم خوردہ ہیں یہی حال ایرانیوں کا تھا۔ حیدری تبریزی اکبر کا معاصر ہے اور اس نے ہندوستان کی داد و دہش سے بڑا فیض اٹھایا تھا لیکن جب وہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے بارے میں لکھتا ہے تو اس انداز سے:

در کشور ہند شادی و غم معلوم — آں جا دل شاد و جان خرم معلوم
جاے کہ بیک روپیہ آدم نہ خرند — آدم معلوم و قدر آدم معلوم

والہ ہروی لکھتا ہے:

درہند کہ زادگانش تارک ادب اند
لبریز جہالت اند و فاضل لقب اند

حزیں کا بھی یہی خیال ہے کہ ہندوستان فضل و کمال کے لیے "زمینِ شور" کا حکم رکھتا ہے اُسے تمام دار الخلافہ میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو رتبۂ فضیلت رکھتا ہو۔

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ یہ نزاع صرف چند الفاظ کے استعمال کی نہیں تھی بلکہ اس ضمن میں اسالیب و افکار بھی معرضِ بحث میں آ گئے تھے۔ عہدِ حاضر کے ایک ایرانی محقق نے اس ہندی اسکول کی تعریف مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے:

"افکار و احساسات ابنائی ایں سرزمین بہ تاثیر عوامل سیاسی و طبیعی بر سیر در عوام توہم و تخیل و مجسم انگاشتن معانیِ باریک و لطیف کہ از عالم مادہ و جسم دور می باشد متمایل است و در ادائے این تخیلات و توہمات وسائل مزبورہ کہ بہ منزلہ اصل و آنچہ جز او ست از فروع آں می باشد تشبیہ معقولات است بہ محسوسات و بالعکس ولے رعایت تناسب تام بین مشبّہ و مشبّہ بہ و بیان این قبیل تشبیہات است بہ طریق استعارہ کہ نوعے از مبالغہ در تشبیہ می باشد نتیجۂ این سبک[1] بیان پیدایشِ معانی و مضامینے است بسیار غریب و دور از ذہن کسانے کہ بہ افکار ہندی آشنا نیستند و بہترین نامے کہ بہ ایں طرزِ بیان

---

[1] سبک بمعنی روشِ خاص۔

می تواں داد " خیال بندی " است کہ منتخب و مستعمل خود ہندی ہا است۔
نمونہ " خیال بندی " این است کہ از مژهٔ دل داریک مشتِ سوزن بہ سازند و
آن را در خیاط خانهٔ دل بہ ریزند و خیاط گریہ را بہ گویند تا از تکہ ہا و پارہا ے
دل براے چشم پیراہن بہ دوزند و آن گاه این معنی را در قالب الفاظ
فارسی بہ ریزند و بہ گویند :

عرفی ؎ مشتِ سوزن بہ دلم زاں مژه تا ریختہ اند
گریہ از پارهٔ دل دوختہ پیراہنِ چشم

و بہ آن گہ بر سر مژگان بے نم خود خاک بہ ریزند و آن گاه دست دل خود را
بگیرند و بہ اتفاق او بہ گدائی روند تا قدرے غم بہ دست آورند و در ادا ے
ایں معنی گویند :

خاک دیگر بر سر مژگان بے نم می کنم
دست دل می گیرم و دریوزهٔ غم می کنم[1] " (نظیری)

علی اکبر شہابی خراسانی نے " روابط ادبی ایرانی و ہند " میں لکھا ہے کہ اس ہندی طرز نے بعض ایرانیوں کو بھی متاثر کیا لیکن ایران کے بلند طبع اور صاحبِ ذوق لوگوں نے اس تقلید کو کبھی پسند نہیں کیا[2]

شہابی نے " سبک ہندی " کی خصوصیات میں :
" خیال بافی ، مضامین باریک ، افکار پیچ در پیچ ، خیالات دور از طبیعت و استعارات و تشبیہات غیر لطیف و مخصوص بہ ذوق و طبع ہندیان " اور
" مبالغہ و اغراق و بے ہودہ کاری و تکلفاتِ غیر مستحسن " پر زیادہ زور دیا ہے۔
ہمایوں ، اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں ایرانی اثرات نمایاں ہو گئے تھے[3] مغلوں کے

---

[1] بہ حوالہ " روابط ادبی ایران و ہند "
[2] روابط ادبی ایران و ہند (طہران) ص ۹۱
[3] " مغلوں کے تعلقات ایران سے " : از اے رحیم اسلامک کلچرل حیدر آباد دکن ۱۹۳۴ء

آخری زمانے میں تو سیاسی عنانِ اختیار بالکل ایرانیوں کے ہاتھوں میں آگئی تھی ــــــ سرجادو ناتھ سرکار نے زوالِ سلطنتِ مغلیہ میں لکھا ہے کہ ۱۷۴۴ء میں ایرانی اثر تمام دربار پر چھا گیا اور تورانی پارٹی کو شکستِ فاش ہوگئی۔ میر آتش کا عہدہ ایک تورانی سے لے کر صفدر جنگ ایرانی کو دے دیا گیا۔ (۱۱ مارچ ۱۷۴۴ء)۔ ۱۷۴۵ء میں بادشاہ کے ایما صفدر جنگ کے لڑکے (نواب) شجاع الدولہ کی شادی، نواب اسحاق خاں دوم نجم الدولہ کی بہن سے کر دی گئی۔ یہی خاتون وارن ہیسٹنگز کے مظالم کا ہدف بنیں اور تاریخ میں نواب بہو بیگم کے نام سے مشہور ہوئیں۔ اس رشتے نے ایرانی اثرات کو اور زیادہ مستحکم کر دیا[1]

حقیقت یہ ہے کہ ۱۷۳۶ء سے مغلوں کی تاریخ، ایرانی اور تورانی جماعتوں کی باہمی آویزش کی داستان ہے۔ سیاست کے علاوہ ادب کے میدان میں بھی یہ آویزش نظر آتی ہے۔

محمد علی حزیں ۱۱۴۶ھ (۱۷۳۳ء) میں ہندوستان آیا ہے اور اس نے ۳۴ برس عمرِ عزیز کے اس سرزمین پر بسر کیے لیکن وہ یہ کبھی نہ بھول سکا کہ "میں ایرانی ہوں" اور یہ لوگ "ہندوستانی"۔ وہ ابوالفضل اور فیضی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

"در زاغانِ ہند ازین دو برادر بہتر ترے نہ خاستہ۔"

سودا کے متعلق حزیں کا یہ جملہ عام طور پر مشہور ہے:

"در پوچ گویانِ ہند خوب می گوئی۔"[2]

اس زمانے میں ناصر علی اور بیدل کا ڈنکا بج رہا تھا لیکن حزیں دونوں کو مہمل سمجھتا تھا۔

"نظمِ ناصر علی و نثرِ بیدل بہ فہم نہ می آید۔ اگر مراجعتِ ایران دست دہد برائے ریشخندِ بزمِ احباب رہ آوردے بہتر ازین نیست۔"[3]

---

[1] سرکار: زوالِ سلطنتِ مغلیہ، ص ۳۵ و ۳۶۔ نیز خاندانِ شیواجی (سرکار) بابِ اوّل، ص ۱-۲۔
[2] شیخ چاند: سودا، ص ۹۹۔ [3] نگارستانِ فارس، ص ۲۱۲۔

حزیں کے ان اعتراضات کے خلاف خان آرزو نے آواز بلند کی اور اس سلسلے میں دو اہم کتابیں تصنیف کیں (۱) تنبیہہ الغافلین (۲) احقاق الحق۔ لیکن صہبائی کو اس کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہے۔

تنبیہہ الغافلین[1] میں خان آرزو نے حزیں کے دیوانِ چہارم پر اعتراضات کیے ہیں اور اس کے تقریباً چار سو اشعار کو غلط ٹھہرایا ہے۔ آرزو کی چند غلطیاں مطلع السعدین میں سیالکوٹی مل وارستہ نے بھی بیان کی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حزیں کی ایرانیت سے بہت مرعوب ہے۔

یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ حزیں نے "تنبیہہ الغافلین" کا جواب لکھا اور اس کا نام "رجم الشیاطین" رکھا۔ (نگارستان، ص ۲۱۳) لیکن یہ کتاب ناپید ہے اور جناب منوہر سہائے انور تو اس کے وجود ہی کے منکر ہیں۔

۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۰ء میں مولوی امام بخش صہبائی نے قولِ فیصل کے نام سے بظاہر ایک غیر جانب دارانہ کتاب لکھی لیکن اس کی بھی طرز و روش سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صہبائی، حزیں کی طرفداری پر تُلے ہوئے ہیں۔

صہبائی نے آرزو کے اعتراضات رد کیے ہیں اور حزیں کی حمایت میں ایرانی شعرا سے استناد کیا ہے[2] لیکن بعض جگہ وہ بھی سپر ڈالنے پر مجبور ہو گئے ہیں:

"نظارگیان این نسخہ دریافتہ باشند کہ صہبائی ہیچ مداں کمر ہمت راچست بستہ در ہر مقام قصدِ آن دارد کہ توجیہے برائے کلام شیخ بہم رساند اما چہ کند در امثال این مقامات سپر می افگند[3]"

اس مباحثے میں اس زمانے کے تمام اہلِ علم نے حصہ لیا ہے۔ 'مردم دیدہ' کے مؤلف نے آرزو کے بیشتر اعتراضات غلط قرار دیے ہیں۔ مرزا علی لطف نے بھی

---

[1] ۱۱۵۶ھ (۴۳-۱۷۴۳ء) میں لکھی گئی۔

[2] ملاحظہ ہو: غوامض سخن۔ (صہبائی) ص ۶۸۳، ۷۳۱۔

[3] قولِ فیصل، لکھنؤ ایڈیشن، ص ۱۳۵۔

ان کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ چنانچہ گلشنِ ہند میں لکھتے ہیں :

"۱۱۴۷ھ میں کہ شیخ محمد علی حزیں علی الرحمۃ ایران سے شاہ جہاں آباد میں تشریف لائے تو اس یگانۂ روزگار کی ملاقات کو شاہ و گدا سب آئے۔ سراج الدین علی خاں سے جس قدر اخلاق کہ مناسب ان کے حال کے پایا شیخ نے ادا فرمایا۔ لیکن اس بزرگ زادے نے نسبت غرور کی شیخ کی طرف منسوب کی اور ناحق اپنی طبیعت اُن سے محجوب کی، آزردہ خاطر وہاں سے گھر آئے اور دیوان شیخ کا دیکھ کر بہت سے شعر سقیم ٹھہرائے۔ چنانچہ وہ سب اعتراضات جمع کر کے ایک رسالہ رکھا ہے اور نام اس کا تنبیہہ الغافلین رکھا ہے۔ عوام کی طبیعت تو ان اعتراضوں سے البتہ تشویش میں پڑتی ہے۔ یہیں تو صاف نزاع معلوم ہوتی ہے۔ جب باریک بینوں کی نگاہ اس سے جا لڑتی ہے[1]۔"

خان بہادر رضا علی وحشت کلکتوی نے ایک مضمون حزیں پر جولائی ۱۹۰۹ء کے مخزن میں لکھا تھا اور اس میں بھی یہ ثابت کیا تھا کہ آرزو کے بعض اعتراضات کسی طرح بھی وقیع نہیں ہوسکتے۔ خان آرزو نے بھی حد کردی ہے۔ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے اس نے خاقانی کو بھی اپنے اعتراضات کی تیغ سے زخمی کیا ہے اور یہ محض اس لیے کہ حزیں نے خاقانی کو سند کے طور پر پیش کیا تھا۔

غالباً خان آرزو نے تنبیہہ الغافلین کے بعد ایک اور چھوٹا سا رسالہ حزیں کی مخالفت میں احقاق الحق کے نام سے لکھا ہے۔ مولانا صہبائی نے اس کا جواب اعلاء الحق کے نام سے دیا۔ لیکن تمام اعتراضات کا احاطہ نہیں کیا ہے۔

اعلاء الحق کا لب و لہجہ نہایت درشت اور تلخ ہے۔ خانِ آرزو کے متعلق لکھا ہے :

"معرکہ ساز عرصہ لاف، عناں گستہ نفس سوزی ہائے گزاف، تہمت زدہ

---

[1] گلشنِ ہند، مطبوعہ علی گڑھ، ص ۲۱

امتیاز باطل وحق، صاحبِ نسخۂ احقاق الحق[1]۔

ہم نے ادھر جو مرزا علی لطف کا بیان نقل کیا ہے اس سے یہ خیال نہ پیدا ہونا چاہیے کہ حزیں اور خانِ آرزو کی رنجش صرف ذاتی اغراض کا نتیجہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ حزیں کی کم نگاہی اور آرزو کی ناگواری کی سطح کے نیچے ایرانی ہندی کشمکش کارفرما تھی۔ تذکرہ حسینی میں صاف لکھا ہے کہ خانِ آرزو کی مخالفت کا سبب یہ تھا کہ حزیں فارسی دانانِ ہند کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

آرزو اور حزیں کی ملاقات کا لطیفہ تقریباً تمام تذکرہ نویسوں نے نقل کیا ہے اور سب اس پر متفق ہیں کہ آرزو وہاں سے دل شکستہ لوٹے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ میر محمد افضل ثابت اور آرزو نے حزیں کے اس شعر پر اعتراض کیا:

ہر گہہ کہ بہ یادِ دہنت غنچہ نشستم
اندیشہ مرا سر بہ گریبانِ عدم زاد

حزیں ان "جاہلانِ ہند" کے اعتراض پر یہ کہہ کر چپ ہو گیا کہ ان کو فارسی سے کیا واسطہ۔

حزیں کے اخلاق و عادات میں جو چیز سب سے نمایاں ہے وہ اس کی آزاد منشی اور خود پسندی ہے۔ وہ خود کہتا ہے ؎

لائقِ مدح در زمانہ چو نیست
خویشتن را ہمی سپاس کنم

شاہ عالم اور شجاع الدولہ خود اس کے گھر آتے تھے اور ادب اور تعظیم بجا لاتے تھے لیکن وہ ہندوستانی امیروں کو اس لائق نہیں سمجھتا تھا کہ ان کی ملازمت اختیار کرے۔

؎ یکے از عقل زند لاف کہ بایست گرفت | دامن عاطفت شاہ عطا بخش و وزیر
آن یکے می دہم پند کہ در ہند مجوئے | کام بے تربیت قدر شناسانِ امیر

---

[1] اعلاء الحق، نظامی پریس، ص ۷۰۔ صاحب نسخہ احقاق الحق سے شبہ ہوتا ہے کہ صہبائی آرزو کو احقاق الحق کا مصنف نہیں سمجھتے۔

محمد شاہ کے زمانے میں ایرانیوں کا زور بہت بڑھ گیا تھا۔ بادشاہ نے کئی مرتبہ حزیں کو قلمدانِ وزارت پیش کیا لیکن اس نے انکار کر دیا[1]

ایسا آدمی خان آرزو کی قابلیت کا کب معترف ہو سکتا تھا۔ آزاد نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ کسی شخص نے آرزو کی یہ غزل بڑے فخر کے ساتھ حزیں کے سامنے پڑھی ؎

خجل از روے حبابم کہ بہ این تنگیِ ظرف
انچہ در کیسۂ خود داشت بہ دریا بخشید

حزیں نے فوراً اصلاح کی ؎

خجل از چشم حبابم کہ بہ یک ظرف تنک
آن چہ در کاسۂ خود داشت بہ دریا بخشید

اور کہا "این بابا از کیسہ تا کاسہ واز تنکی و تنگی فرق نہ می کند و باز خود را شاعر گوید"۔

آزاد ہی نے ایک اور واقعہ نقل کیا ہے جو دلچسپی سے خالی نہیں۔ آرزو کے ایک عقیدت مند (یعنی شاہ لطف اللہ) حزیں کے پاس پہنچے اور اپنا تعارف کرائے بغیر اس شعر کی درخواست کی ؎

بتے دارم کہ باشد از حیا مشاطگی ننگش
حنا گر پاے او بوسد ز شوخی می پرو رنگش

حزیں نے کہا: "معلوم می شود کہ از کاسہ لیسانِ حرام زادۂ اکبرآباد است"۔

آزاد کے اکثر بیانات غلط ہیں چنانچہ یہ روایت بھی صحیح معلوم نہیں ہوتی، اس لیے کہ شاہ لطف اللہ کا انتقال حزیں کے ہندوستان آنے سے قبل ہو چکا تھا لیکن ان قصوں سے حزیں اور آرزو کے تعلقات کی نوعیت عوام کی نظروں میں ضرور معلوم ہو جاتی ہے۔

تذکرۃ الاحوال کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حزیں کو اپنی قابلیت اور ایرانی النسل ہونے کا غیر معمولی احساس تھا اور ان کی بد دماغی کبھی دوسرے کے

---

[1] یہ بات قابل ذکر ہے کہ سیر المتاخرین کے مصنف کو حزیں سے بڑا غلو تھا۔

محاسن کا اعتراف نہیں کر سکتی تھی۔[1]

اس کے بعد ایرانی ہندی نزاع، معرکۂ حامیانِ قتیل و غالب کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ مرزا غالب اپنا رشتۂ ادبی دودۂ جم سے جوڑتے تھے اور اس پر انھیں غیر معمولی فخر و ناز تھا۔ اس قسم کے اشعار ان کے کلام میں جا بجا ملتے ہیں ؎

غالب بہ گہر ز دودۂ زادشمم
زاں رو بصفائے دم تیغ ست دمم

گہر از رایت شاہان عجم برچیدند | بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند
افسر از تارک ترکان پشنگی بردند | بہ سخن ناصیۂ فر کیانم دادند

ساقی چو من پشنگی و افراسیابیم | دانی کہ اصل گوہرم از دودۂ جم است
میراث جم کہ مے بود اکنوں بمن سپار | زاں پس رسد بہشت کہ میراث آدم است

مرزا غالب، سراج الدین احمد کو لکھتے ہیں :

"ترک نژادم و نسب من بہ افراسیاب و پشنگ می پیوندد۔"

جو شخص دودۂ جم سے تعلق رکھتا ہو، وہ فارسی نویسانِ ہند کو کب خاطر میں لا سکتا تھا۔

غالب نے قاطع برہان میں اپنے آپ کو اہلِ زبان میں شامل نہیں کیا : "حاشا کہ خود را از اہلِ زبان گیرم" لیکن انھوں نے اپنی زباں دانی کی سلاق اور راستی پر اتنا زور دیا ہے کہ وہ صرف اہلِ زبان ہی کو سزاوار ہو سکتا ہے یا اس شخص کو جس کے عجز میں ہزار غرور پوشیدہ ہوں۔

غالب کا دعویٰ یہ ہے کہ زبانِ فارسی سے ان کو "پیوند ازلی" ہے اور ایک "جاماسپ عہد" اور "بزرجمہر عصر" کے سامنے انھوں نے زانوے ادب بھی تہ کیا تھا۔

---

[1] نیز ملاحظہ ہو پروفیسر سید حسن عسکری (پٹنہ) کا مقالہ "شیخ علی حزیں پر کچھ نئی روشنی" جو انھوں نے ۱۹۳۸ء میں انڈین ہسٹری کانگریس الہ آباد میں پڑھا تھا اور جناب سرفراز خاں صاحب کا مقالہ شیخ محمد علی حزیں پر۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ :

" ملا عبدالصمد (ہرمزد۔ استاد غالب) غیر معمولی علم و استعداد کا شخص تھا۔
بلاشبہ مرزا غالب کی غیر معمولی فارسی مناسبت و رسوخ میں اس کی تعلیم کو بڑا
دخل ہوگا.... عبدالصمد پر سنسکرت اور قدیم فارسی کے باہمی رشتے کا راز
کھل چکا تھا۔ دونوں زبانوں کے مرادفات کی صحیح مثالیں اسے معلوم تھیں۔
سر ولیم جونس وغیرہ کے ابتدائی مباحث میں انھیں سے کام لیا گیا ہے[1]"۔

ملا عبدالصمد کا وجود تھا یا نہیں۔ یہ مسئلہ بڑا مباحثہ انگیز[2] ہے لیکن خود غالب کا بیان
یہ ہے کہ اس کی مدد سے فارسی زبان کی حقیقت "دل نشین" اور "خاطر نشان" ہوگئی۔
لیکن اس معاملے میں انھوں نے اتنا غلو کیا کہ وہ اپنے آپ کو فارسی کا تنہا
وارث سمجھتے تھے اور ابتدا ہی سے ہندوستان کے متقدمین و متاخرین فارسی دانوں
میں سے ایک آدھ کو چھوڑ کر باقی کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے[3]۔ ان کے غرور کی
شاید اس سے بہتر مثال نہ مل سکے ؎

ہر چند زمانہ مجمع جہال است   وز جہل نہ حال شاں بہ یک منوال است
کو دن ہمہ لیک از یکے دگرے   فرقِ خرِ عیسیٰ و خرِ دجال است

معرکۂ حامیانِ قتیل و غالب اسی ایرانی ہندی نزاع کی ایک کڑی ہے۔
غالب کی قتیل دشمنی کو اگر اس پس منظر کے ساتھ دیکھا جائے تو ان کے انکار و امیال
اور موافقت و مخالفت کی بہت سی گتھیاں سلجھائی جا سکتی ہیں۔

اس ادبی ہنگامے کے برپا ہونے کا فوری سبب یہ ہوا کہ مرزا غالب اپنی پنشن کے
سلسلے میں ۱۸۲۸ء میں کلکتہ پہنچے۔ وہاں ایک مشاعرے میں غالب نے "گماں برخیزد"
"میاں برخیزد" غزل پڑھی۔ اس غزل کا ایک شعر ہے ؎

---

[1] "غالب" از غلام رسول مہر : ۲۷۔
[2] دیکھیے "غالب کا ایک فرضی استاد" علی گڑھ میگزین "غالب نمبر" : ۶۵۔
[3] ملاحظہ ہو، غالب نامہ، ص ۳۲۔

جزد از عالم و از ہمہ عالم بیشم
ہم چو موئے کہ بتاں را زمیاں برخیزد

اس پر یہ اعتراض کیا گیا کہ عالم مفرد ہے، ہمہ کے ساتھ اس کا ربط بہ اجتہادِ قتیل درست نہیں ہے۔ کفایت خاں رئیس ہرات بھی مشاعرے میں موجود تھے۔ انھوں نے "ہمہ عالم" کی سند سعدی و حافظ کے کلام سے پیش کی لیکن اس سے مخالفین کا اطمینان نہیں ہوا۔

دوسرا اعتراض یہ کیا گیا کہ "زمیاں برخیزد" صحیح نہیں ہے۔

تیسرا اعتراض "کدہ" کے استعمال پر تھا[1]

غالب نے ان اعتراضات پر جل کر کہا کہ "میں فرید آباد کے کھتری بچے کا قول نہیں مانتا۔"

کلکتہ میں غالب کے معترضین کی تعداد کافی تھی اور ان کی مخالفت کی ایک وجہ عبدالغفور نساخ نے یہ لکھی ہے کہ کلکتہ کے قیام میں غالب کا ملنا جلنا زیادہ تر ایرانیوں سے تھا۔ ان لوگوں نے ان کے کلام کی خاطر خواہ تعریف و توصیف کی۔ بلکہ کفایت خاں نے کلکتہ کے شاعروں کو چھوڑ کر صرف غالب ہی کی قدر افزائی کی۔ حاجی عبدالکریم اصفہانی کلکتہ کے بہت بڑے تاجر تھے۔ ان کے یہاں ایک ایرانی فاضل مرزا کوچک نام مقیم تھے۔ انھوں نے مجلسِ عام میں کھڑے ہو کر کہہ دیا تھا: اس درجہ کا شاعر آج سرزمینِ ایران میں بھی کوئی نہیں[2]۔ یہ باتیں مخالفین برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

غالب نے اس واقعہ کی محمد علی خاں صدر امین باندہ کو اس طرح اطلاع دی ہے:

"از نوادر حالات ایں کہ سخن وران و نکتہ رسان ایں بقعہ پس از ورودِ خاکسار بزم سخنے آراستہ بودند۔ در ہر ماہ شمسی انگریزی روز یک شنبہ نخستین سخن گویاں در مدرسہ سرکار کمپنی فراہم شدندے، و غزلہائے ہندی و فارسی خواندندے ناگاہ گراں مایہ مردے کہ از ہرات بہ سفارت

---

[1] ملاحظہ ہو، غالب نامہ، ص ۳۲

[2] غالب از مہر، اشاعت سوم: ۱۲۳ بہ روایت مولانا ابوالکلام آزاد۔

رسیده است دراں انجمن می رسد و اشعار مرا شنوده به بانگِ بلند نامی ستائد و بر کلام نادرہ گویانِ این قلمرو تبسّم ہاے زیرلبی می فرماید چوں طبائع بالذات مفتونِ خود نمائی است ہم گناں حسد می برند و کلانانِ انجمن و فرزانگانِ فن بر دو بیت من اعتراض نادرست برآوردہ آں را شہرت می دہند[1]"

مرزا غالب نے اعتراض سے تنگ آکر ایک مثنوی "بادِ مخالف[2]" لکھی جس میں سخن پروران کلکتہ سے معذرت کی لیکن اس مصالحت میں بھی کئی نشتر چھپے ہوئے تھے، لکھتے ہیں: ' نہ میں نے قتیل کی صحبت سے فیض حاصل کیا، نہ اس کی شہرت پر رشک ہے نہ اسے بُرا کہتا ہوں لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ :

دامن از کف کنم چگونہ رہا	طالب و عرفی و نظیری را
خاصہ روحِ روانِ معنی را	آن ظہوری جہانِ معنی را
آں کہ طے کردہ ایں مواقف را	چہ شناسد قتیل و واقف را
می شوم خویش را بہ صلح دلیل	می سرایم نواے مدح قتیل
تا نہ ماند زمن دگر گلہ'	رسد از پیروانِ دے صلۂ
گرچہ ایذائیش نہ خواہم گفت	سعدی ثانیش نہ خواہم گفت
لیک از من ہزار بار بہ است	از من و ہم چو من ہزار بہ است
من کفِ خاک و او سپہر بلند	خاک را کے رسد بہ چرخ بلند

---

[1] کلیات نثر غالب : ۱۷۱ (نول کشور ۱۲۸۷ھ) ۔ خطوط بنام عبدالغفور سرور اور عبدالرزاق شاکر بھی دیکھے جائیں : عود ہندی صفحات : ۱۷، ۱۷۶ (طبع علی گڑھ ۱۹۲۷ء) ۔

[2] نیز ملاحظہ ہو" بادِ مخالف کی اوّلین روایت" از قاضی عبدالودود ۔ بڑے تماشے کی بات یہ ہے کہ غالب قتیل کی بڑی تعریف کرتے ہیں، ہجو ملیح ہی سہی، مگر اس کی سند اس بنا پر کہ وہ ہندی ہے قبول نہیں کرتے ۔ مگر بیدل کی سند خود پیش کرتے ہیں ۔" شعر بیدل بجز تفنن نیست " اولین روایت میں نہیں، بعد کو بڑھایا ہے ۔

وصف او حد چو منے نہ بود — بہرہ در خور دو روز سنے نہ بود
مرحبا ساز خوش بیانیٔ او — حبذا شور نکتہ دانیٔ او
نظمش آبِ حیات راماند — در روانی فرات راماند
نثر او نقش بال طاوس است — انتخاب صراح وقاموس است
بادشاہے کہ در قلم رو حرف — کردہ ایجاد نکتہ ہاے شگرف
خام ہندوے پارسی دانش — ہندیاں سر بہ خط فرمانش
این رقم ہا کہ ریخت کلک خیال — بود سطرے ز نامۂ اعمال
از منِ نارسائے ہیچ مداں — معذرت نامہ ایست اے یاراں
بو کہ آید ز عذر خواہی ما — رحم بر ما و بے گناہی ما
آشتی نامہ و وِداد پیام — ختم شد والسلام والاکرام

غالب کی پریشانیوں میں پنشن کے مقدمے کو بڑا دخل حاصل ہے جس میں وہ ۱۸۲۷ء سے ۱۸۴۴ء تک اُلجھے رہے اور روپیہ ملنے کی اُمید میں قرض لیتے رہے۔ ۱۸۴۷ء میں وہ "غمِ رسوائیٔ جاوید" یعنی قید فرنگ میں مبتلا ہو گئے۔

غرض غدر کے زمانے تک ان کو اتنا اطمینان نہ مل سکا کہ ہمنوایانِ قتیل کے خلاف کوئی موثر قدم اُٹھا سکیں۔

غدر کے زمانے میں مرزا غالب نے ایک روزنامچہ "دستنبو" کے نام سے لکھا اس میں انھوں نے خالص فارسی میں "جہاں دارانِ داد آموز، دانش اندوز، نکوخو، نکونام" (انگریزوں) کی تباہی اور بربادی کا بھی ذکر کیا ہے اور یکم اگست ۱۸۵۸ء تک کے حالات جمع کیے ہیں۔ غدر کی خانہ نشینی ہی کے زمانے میں انھوں نے 'برہانِ قاطع' دیکھنا شروع کی اور اس کے اغلاط نوٹ کرتے رہے۔ غالب نے ان کو ایک علاحدہ رسالے کی صورت میں ۱۸۶۰ء میں مرتب کیا اور ۱۸۶۲ء میں چھپوایا۔[1]

[1] 'قاطعِ برہان' کا دوسرا اڈیشن 'درفش کاویانی' کے نام سے مع اضافۂ مطالب و فوائد ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا۔

'قاطع برہان' کی اشاعت نے ۱۸۶۲ء کے کلکتہ والے ہنگامے کو پھر تازہ کر دیا بہ قول غالب "باسی کڑھی میں اُبال آگیا"۔ اور ان کو آخر وقت تک اس مخالفت سے نجات نہیں ملی۔

'قاطع برہان' ایسی ہنگامہ خیز کتاب تھی کہ کچھ عرصے کے لیے ساری فضا مکدّر ہوگئی اور مخالفانہ لٹریچر کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا — اس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

(۱) 'محرقِ قاطع' (مولوی سعادت علی خاں)
(۲) 'ساطع برہان' (مرزا رحیم بیگ میرٹھی)
(۳) 'قاطع القاطع' (امین الدین پٹیالوی)
(۴) 'موئدِ برہان' (آغا احمد علی)
(۵) 'تیغِ تیز تر'
(۶) 'شمشیر تیز تر' (آغا احمد علی)

اس مخالفانہ لٹریچر کا جواب غالب کے دوستوں اور موئدوں کی طرف سے ان کتابوں کے ذریعے دیا گیا۔

(۱) 'دافعِ ہذیان' (مولوی نجف علی)
(۲) 'لطائفِ غیبی' (سیف الحق سیّاح) مہر کا قیاس ہے کہ یہ کتاب غالب کی لکھی ہوئی ہے[1]
(۳) 'سوالاتِ عبدالکریم'۔
(۴) 'نامۂ غالب' از مرزا غالب
(۵) 'تیغِ تیز' مولفۂ غالب
(۶) 'ہنگامۂ دل آشوب' وغیرہ۔

اس معارضے میں تلخی کا پیدا نہ ہونا حیرت انگیز تھا۔ چنانچہ موافق و مخالف دونوں جماعتیں نا ملائم الفاظ پر اُتر آئیں اور طنز اور دشنام کے ترکش کا کوئی تیر

[1] 'غالب': ۴۳۱ اشاعت سوم' نیز ملاحظہ ہو: علی گڑھ میگزین غالب نمبر: لطائفِ غیبی اور غالب از عبدالمجید سالک : ۱۲۳

ایسا نہیں تھا جو انھوں نے صرف نہ کیا ہو۔

اس تمام لٹریچر کو اس نظر سے جانچنا اور پرکھنا کہ غالب کے اعتراضات کہاں تک درست تھے، تحقیق کا ایک دلچسپ موضوع ہے اور اس کے لیے ایک علاحدہ فرصت درکار ہے۔ ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ ایرانی ہندی نزاع کے سلسلے میں اس کی کیا حیثیت اور اہمیت ہے۔

اگر جذبات سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو ماننا پڑے گا کہ غالب نے قاطعِ برہان لکھ کر علمی خدمت انجام دی اور اس ایرانی ہندی نزاع کے بعض ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی جو اب تک تشنۂ بحث تھے۔

رضا علی خاں ہدایت صاحب مجمع الفصحا نے فرہنگ انجمن آرائے ناصری میں غالب کے بعض[1] اعتراضات کو صحیح مانا ہے۔ لیکن اس بحثا بحثی میں ذاتیات پر حملے ہونے لگے اور رفتہ رفتہ اس مباحثے کی علمی اور تحقیقی حیثیت ختم ہو گئی۔

مرزا غالب شروع ہی سے قتیل و واقف کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور اپنے آپ کو عرفی و ظہوری کا ہم مرتبہ سمجھتے تھے۔ کلکتہ کے مشاعرے اور برہانِ قاطع کے ہنگامے نے غالب کے جذبۂ مخالفت میں شدّت اور عصبیت پیدا کر دی۔ ان کی مخالفت کا یہ عالم تھا کہ جس سے بھی قتیل کا تعلق سُن پاتے تھے، اس کے دشمن ہو جاتے تھے۔ مولوی غیاث الدین رام پوری مولف غیاث اللغات نے قتیل کی 'چار شربت' کا بھی حوالہ دیا ہے۔ غالب اس تعلق کو کب برداست کر سکتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"غیاث الدین رام پوری ایک ملائے مکتبی تھا۔ ناقل ناعاقل۔ جس کا ماخذ

---

[1] قاضی عبدالودود صاحب کا خیال ہے کہ ان مسائل کے بارے میں جو غالب اور حامیانِ برہانِ قاطع میں مابہ النزاع ہیں، ہدایت نے جو کچھ لکھا ہے (فرہنگ نگار کی حیثیت سے، نزاع کی طرف اشارہ کیے بغیر اور اس سے کسی قسم کی واقفیت کا اظہار کیے بغیر) وہ اسّی فی صد وہی ہے جو برہان میں ہے۔

اور مستند علیہ قتیل کا کلام ہوگا۔ اس کا فنِ لغت میں کیا فرجام ہوگا[1]"

مولوی غلام امام شہید چونکہ قتیل کے شاگرد تھے، اس لیے ان کے متعلق ذکا حیدر آبادی کو لکھتے ہیں:

"سنتا ہوں کہ مولوی غلام امام شہید شاگرد قتیل وہاں کوسِ اناولاغیری بجا رہے ہیں اور سخن ناشناسوں کو اپنا زورِ طبع دکھا رہے ہیں[2]"

غالب ہر جگہ قتیل کو ہندی فارسی دانوں کا نمایندہ اور اپنے آپ کو فارسی دایان ایرانی نژاد کا علم بردار سمجھتے ہیں:

"یہ فارسی لالہ قتیل کی ہے" "ایک گاو بچہ بہ روزِ سحر کچھ باتیں کرنے لگا۔ بنی اسرائیل اسے خدا سمجھے"

"قتیل اساتذۂ سلف کے کلام سے قطعاً ناآشنا ہی نہیں اس کے علم فارسی کا ماخذ ان لوگوں کی تقریر ہے جو کہ نواب سعادت علی خاں کے وقت میں ممالک مغربی کی طرف سے لکھنؤ میں آئے اور ہنگامہ آرا ہوئے۔ بیش تر سادہ کشمیری یا کابلی یا قندھاری و مکرانی۔ احیاناً عامہ اہلِ ایران میں سے بھی کوئی ہو، مانا عظماے ایران میں سے بھی کوئی ہوگا۔ تقریر اور ہے تحریر اور ہے۔ اگر تقریر بہ عینہ تحریر میں آیا کرے تو خواجہ وطواط اور شرف الدین علی یزدی اور ملا حسین واعظ کاشفی اور طاہر وحید یہ سب نثر میں کیوں خونِ جگر کھاتے۔ وہ سب اسی طرح کی نثر میں جو لالہ دیوالی سنگھ قتیل متوفی نے بہ تقلید اہل ایران لکھی ہے، رقم نہ فرماتے[3]"

صاحب عالم کو لکھتے ہیں:

"اصل فارسی کو اس کھتری بچہ قتیل علیہ ما علیہ نے تباہ کیا، رہا سہا غیاث الدین

---

[1] خطوط غالب، ص ۱۱۷۔

[2] اُردوے معلّٰی: ۳۷۸ (لاہور ۱۹۳۰ء)۔

[3] خطوط غالب: (بنام قاضی عبدالجمیل)۔

[4] عود ہندی: ۱۵ (طبع علی گڑھ، عبدالغفور سرور کے نام۔

رامپوری نے لکھو دیا۔ غور کرو کہ وہ خران ناشخص کیا کہتے ہیں، اور میں خستہ و دردمند کیا بکتا ہوں۔ واللہ نہ قتیل فارسی شعر کہتا ہے اور نہ غیاث الدین فارسی جانتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ان غولوں پر لعنت کرو[1]۔"

قدر بلگرامی کو لکھتے ہیں :

"مگر یہ پیروی قتیل کی ہے کہ وہ ایرانیوں کی تقریر کے موافق تحریر بناتا ہے[2]۔"

تفتہ کو لکھتے ہیں :

"لفظ "بے پیر" تورانی بچہ ہائے ہندی نژاد کا تراشا ہوا ہے۔ مرزا جلال اسیر علیہ الرحمہ مختار ہیں اور ان کا کلام سند ہے۔ میری کیا مجال ہے کہ ان کے باندھے ہوئے لفظ کو غلط کہوں لیکن تعجب ہے اور بہت تعجب ہے کہ امیرزادۂ ایران ایسا لفظ لکھے[3]۔"

مرزا غالب یہ سمجھتے تھے کہ زبان دانی، فارسی میری ازلی دست گاہ ہے اور یہ عطیہ خاص منجانب اللہ ہے اس لیے اگر کوئی غلطی ان کی دانست میں ایرانیوں سے بھی ہوئی ہے تو اس پر بھی تعجب[4] کا اظہار کیا ہے۔ ایک اور موقع پر تفتہ کو لکھتے ہیں :

"فارسی میں مبداء فیاض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد وضوابط

---

[1] عود ہندی : ۲۲   [2] اُردوے معلّیٰ : ۴۰۳

[3] خطوط غالب : ۱۹ حالانکہ بے پیر بہت قدیم ترکیب ہے۔ خاقانی، طالب آملی، صائب اور اشرف کے یہاں موجود ہے ("غالب بہ حیثیت محقق" علی گڑھ میگزین۔ غالب نمبر: ۱۹۰)۔

[4] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کورانہ تقلید کے قائل نہیں تھے۔ حزیں کے ایک مطلع کا ذکر کرتے ہوئے تفتہ کو لکھتے ہیں : "حزیں کے اس مطلع میں واقعی ایک ہنوز زاید اور بے ہودہ ہے۔ متبع کے واسطے سند نہیں ہو سکتا۔ یہ غلط محض ہے، یہ ستم ہے، یہ عیب ہے، اس کی پیروی کون کرے گا۔ حزیں تو آدمی تھا، یہ مطلع اگر جبرئیل کا ہوتا تو اس کو سند نہ جانو" (خطوط غالب، ص ۲۳)۔ وہ مطلع یہ ہے ؎

ز ترک تازیِ آں نازنیں سوار ہنوز   ز سبزہ می دمد انگشت زینہار ہنوز

اسی خط میں لکھتے ہیں : "نظر شگفتن" اور "گوش شگفتن" ہم نہیں جانتے اگرچہ منشی ہرگوپال تفتہ اور ملا نور الدین ظہوری نے لکھا ہو" (خطوط غالب : ص ۲۲)

میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر[1]۔"

"سنو میاں، میرے ہم وطن جو وادی فارسی میں دم مارتے ہیں، وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں، جیسا وہ گھامڑ اُلّو عبدالواسع لفظ 'نامراد' کو غلط کہتا ہے اور یہ اُلّو کا پٹھا قتیل "صفوت کدہ" .... اور "ہمہ عالم" کو غلط کہتا ہے، کیا میں بھی ویسا ہی ہوں جو "یک زبان" کو غلط کہوں گا۔ فارسی کی میزان یعنی ترازو میرے ہاتھ میں ہے، للہ الحمد وللہ الشکر[2]۔"

یہی وجہ ہے کہ غالب ہندوستان کے سخن وروں میں سوائے خسرو کے اور کسی کو مسلّم الثبوت نہیں سمجھتے تھے۔ سرور کو لکھتے ہیں:

"میں اہلِ زبان کا پیرو اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں۔ جب تک قدما یا متاخرین میں مثل صائب و کلیم و اسیر و حزیں کے کلام میں کوئی لفظ یا ترکیب نہیں دیکھ لیتا اس کو نظم و نثر میں نہیں لکھتا[3]۔"

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں:

"کلامِ سعدی و حزیں اور ان کے امثال و نظائر کا معتمد علیہ ہے۔ نہ آرزو اور واقف اور قتیل وغیرہم کا۔"

---

[1] [2] خطوط غالب: ۴۲۔
[3] عود ہندی: ۱۸ طبع علی گڑھ۔

غالبؔ کی دلّی

غالب کی دلّی عالم میں انتخاب تھی۔ سر سول اسر کے الفاظ میں چین کے ساحل سے لے کر قسطنطنیہ تک کوئی شہر دیدہ و دانش میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ صرف شہر نہیں ایک بڑی تہذیب کا مرکز اور علم و فن کا گہوارہ تھا۔ ہماری گنگا جمنی تہذیب نے یہیں پرورش پائی تھی۔ معمولی بولیوں کو ادب کی کرسی نشینی کا شرف یہیں حاصل ہوا تھا۔ گیسوئے اردو یہیں سنوارے گئے تھے۔ حاتم سے لے کر حالی تک تمام اسالیب یہیں وجود میں آئے تھے۔ یہیں تصوف نے انسانیت اور دردمندی کا ایک وسیع تر تصور پیش کیا تھا۔ علم حدیث نے یہیں ترقی کی اعلا منزلیں طے کی تھیں۔ علم طب نے یہیں مسیحائی کی تھی۔ یہیں علم و ادب کی شمع کو اس شان سے فروزاں کیا گیا تھا۔ کہ دور دور تک تاریکیاں چھٹ گئیں۔ یہیں علم دین و شعر و حکمت، طب اور تاریخ و نجوم میں وہ معیار قایم کیے گئے کہ غرناطہ و بغداد کی یاد تازہ ہو گئی۔

سلطنت مغلیہ کی حیثیت ایک عظیم الشان درخت کی سی تھی جس کی جڑیں دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ بہادر شاہ اول کے زمانے سے لے کر

نادر شاہ کے حملے تک اس کے ٹہنے لوٹ لوٹ کر گرتے تو رہے لیکن اس کی جڑوں کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔ مغلوں کی بربادی دراصل ۱۷۲۹ء سے شروع ہوتی ہے۔ نادر شاہ کے حملے نے ان کی کمر توڑ دی اور بقول حضرت شاہ ولی اللہ "از سلطنت بجز نامے باقی نماند"، نادر شاہ نے ہندوستانیوں کا وہ ستم اؤ کیا کہ سڑکوں پر لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ بستیاں ویران اور بے چراغ ہوگئیں۔ ایک وقت تو ایسا آگیا تھا کہ مسلمانوں نے جوہر کی رسم ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مال غنیمت بھی جو ہاتھ لگا اس کی مالیت آٹھ کروڑ سے کم نہ تھی۔ یہ دولت ایک دن کی نہیں، آٹھ پیڑیوں کی جمع کی ہوئی تھی۔ آنند رام مخلص کا خیال ہے کہ صرف جواہرات کی قیمت پچاس کروڑ سے زیادہ ہوگی۔ جان کا نقصان اس سے زیادہ تھا۔ ایرانی مورخین کا اندازہ ہے کہ اس ہنگامہ وآشوب میں تیس ہزار سے کم آدمی تہ تیغ نہ ہوئے ہوں گے۔

نادر شاہ کی غارت گری کے بعد لوٹ کھسوٹ کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ جاٹ مرہٹے۔ روہیلے اور فرنگی سب ہی ظلم وستم پر آمادہ تھے۔ ہرچرن داس مصنف گلزار شجاعی نے جاٹ گردی کے متعلق لکھا ہے کہ ان کی غارت گری سے ڈر کر دنی کے باشندے اس طرح مارے مارے پھرتے تھے جیسے کوئی ٹوٹا ہوا جہاز ظالم موجوں کے تھپیڑے کھا رہا ہو۔ مرہٹوں کے متعلق گنگا رام نے لکھا ہے کہ وہ دیہاتوں کو لوٹتے۔ لوگوں کے ہاتھ ناک، کان کاٹ لیتے اور خوب صورت عورتوں کو رسیوں میں باندھ کر لے جاتے۔ اسی زمانے میں احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء تک نو مرتبہ ہندوستان کو زیروزبر کیا اور کوئی چیز خوردنی اور پوشیدنی نہیں چھوڑی چھتیں گرادیں۔ کسی کے گھر میں پوشش ستر اور قوت یک روزہ بھی باقی نہیں رہی۔

ان طوفانوں میں عوام خس وخاشاک سے زیادہ مجبور اور بے دست وپا تھے ہر زبردست کے گھوڑے ان کے کھیتوں کو پامال اور ہر جابر امیر کے سپاہی

ان کے گھروں کو بے چراغ کر سکتے تھے۔ روزی کا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔
صبح کو ملی تو شام کی خبر نہیں۔ دست کار، صنّاع، کسان، مزدور، وضیع و
شریف سب ہی پریشان اور مضمحل تھے ـــــ کی زمین کے کم ہو جانے سے
خود شاہی خاندان پر تین تین وقت کے فاقے گزرتے تھے اور "سلاطین" کی
حالت فقیروں سے بھی بدتر تھی۔ نہ جسم پر کپڑا تھا اور نہ پیٹ میں روٹی۔
مرزا رفیع سوداؔ نے شہر آشوب میں لکھا ہے کہ اب نوکری نہیں ملتی۔ اگر
گھوڑا جو کوتل اور مز جھرا ہے لے کر گئے بھی اور نوکری مل بھی گئی تو تنخواہ نہیں
ملتی۔ افلاس کا یہ عالم ہے کہ علف و دانہ کی خاطر

ع شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیئے کے یاں ہے

سوداؔ کا شعر ہے ؎

روپیہ کی شکل تو دیکھی نہیں خدا جانے
کہ اس زمانے میں چپٹا بنے ہے وہ یا گول

سال سال بھر کی ملازمت کے بعد بھی ایک حبہ تنخواہ کا وصول نہیں ہوتا۔
سپاہیوں پر ہی موقوف نہیں ہر پیشے شاعری و ملائی، خطاطی و صنّاعی سب
کا یہی حال تھا۔ جاگیرداری اور اجارہ داری کی لعنتوں نے آسائش اور اطمینان
ختم کر دیا تھا۔ سیاسی انتشار اور اقتصادی بدحالی کے اس اندھیرے میں
انگریز جن کے پیچھے صنعتی انقلاب تھا اور تاریخ کی بڑھتی ہوئی قوتیں تھیں۔
اپنے قدم مضبوطی کے ساتھ جما رہے تھے۔ ہندوستان کی لوٹ ہی سے ان
کے مشینی انقلاب میں جان پڑی تھی۔ مصحفیؔ نے لکھا ہے ؎

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بتدبیر کھینچ لی

انگریزوں نے ۱۷۵۷ء میں بنگال پر اور ۱۷۹۹ء میں میسور پر قبضہ کر کے
ہماری اقتصادی شہ رگ کو کاٹ دیا تھا۔ اور وہ روز بروز اس مامن و فا

یعنی دہلی کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ بقول مصحفی

؎ بس قلعہ کے نیچے ہی تک ایک امن و اماں ہے

چنانچہ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی فوجیں فاتحانہ پرچم کے ساتھ دلّی تک پہنچ گئیں اور انگریزوں نے ضعیف العمر اور نابینا شاہ عالم کو جس کی حکومت بلامبالغہ دہلی سے پالم تک باقی رہ گئی تھی مرہٹوں سے لے کر اپنے قبضہ میں کر لیا۔ سرجی ارجن گانو کے صلح نامے کی رو سے سندھیا نے دوآب کا سارا علاقہ مع آگرہ اور دہلی کے، انگریزوں کے سپرد کر دیا اور وہ تیموری جاہ و جلال جس کے آگے کبھی شان عجم اور شوکت روم حقیر معلوم ہوتی تھی نیست و نابود ہو گیا اور اکبر شاہ ثانی کے متعلق یہ جملہ ضرب المثل بن گیا تھا۔ "اکبر شاہ ثانی۔ چولھے آگ نہ گھڑے پانی" دورانِ تیموریہ کے آخری چشم و چراغ بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں مغلوں کی حکومت لفظاً اور معناً سمٹ کر قلعہ کی چہار دیواری تک رہ گئی تھی۔

لیکن دلّی مٹنے پر بھی ہندوستان کا قلب و جگر اور ایک عظیم الشان تہذیب کی نشانی تھی۔ ہر طرف اسی کی تہذیب کا سکہ رواں تھا اور حضرت دہلی کی تعظیم و تکریم میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ۱۸۱۳ بلکہ اس کے بعد بھی ہندوستان کے فرماں روا اور راجے مہاراجے اپنی تخت نشینی کو اس وقت تک قطعی نہیں سمجھتے تھے جب تک دہلی کے مجبور اور بے دست و پا بادشاہ کی مہر توثیق ثبت نہ ہو جاتے۔[1]

ان انتشاری رجحانات سے یہ سمجھنا کہ اس زمانے کی تاریخ محض شورش پسندی یا عیش کوشی کی داستاں ہے یا اس زمانہ کا ادب، رات اور زلف کی کہانی ہے، صحیح نہیں ہے۔ اجتماعی انحطاط اور سیاسی زوال کے

---

[1]

متعلق جو کچھ بھی کہا جائے لیکن ابھی انفرادی زوال مکمل نہیں ہوا تھا۔ وقت کی ان عام مایوسیوں میں غیرت اور شجاعت۔ ایثار و کرم۔ علم و فن۔ محبت اور رواداری کی حیرت انگیز مثال مل جاتی ہیں۔ غالب کی زندگی اور شاعری کو اسی سیاسی، معاشرتی اور نفسیاتی پس منظر میں دیکھنا چاہیئے۔ اس بڑے نقشہ میں بادشاہوں اور امیروں کی غلط عشقی یا رنگین مزاجی اتنی اہم نہیں جتنی غالب کی حکیمانہ ذہانت اور شگفتہ متانت۔ تاریخ میں ایک محمد شاہ، ایک ابواسحاق، ایک لوئی شانزدہم ہمیشہ ہوا ہے۔ اس کی پرچھائیں اور اس کا نعرۂ ہائے ہو ذرا دیر میں فضا میں تحلیل ہوگیا ہے۔ لیکن جس چیز کو زوال نہیں وہ اس زوال پذیر معاشرہ میں غالب کا ثبات قدم، جینے کا سلیقہ اور اقدار عالیہ پر ایمانِ محکم ہے۔

شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ "مغلوں کے جاہ وجلال کا اصل گہوارہ شاہ جہاں آباد تھا لیکن عجیب اتفاق ہے کہ نہ صرف ان فن تعمیر کا شاہ کار اکبر آباد میں ہے بلکہ ان کے سب سے بڑے شاعر اور ان کی تہذیب و تمدن کے بہترین ترجمان کا مولد بھی وہی بلدۂ حسن و شعر ہے"[1]

مرزا اسد اللہ خاں غالب شب ہشتم ماہ رجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے اور ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو دہلی میں پیوند زمین ہوئے ان تہتر برس اور چار مہینے کی داستان ہمارے خطبات کا اصل موضوع ہے جس کو ہم نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) غالب کی ولادت سے ۱۸۵۷ء کے انقلاب تک اور

(۲) ۱۸۵۷ء سے غالب کی وفات تک

غالب ارض تاج میں پیدا ہوئے جہاں محبت کی سب سے بڑی یادگار ایک

---

[1] غالب نامہ چوتھا ایڈیشن بمبئی ص ۱۷

خوابِ مرمریں کی شکل میں موجود ہے۔ یہیں غالب کی حسیں اور ذہن شاعری کی ابتداء ہوئی جس کا ہر نقش فریادی ہے اور ہر شعر پلکوں سے ڈھلکتا ہوا آنسو

جوں اشک از سرِ مژگاں چکید نم بہ نگر

آگرہ، راجستھانی اور برج بھاشا کے سنگم پر واقع ہے۔ یہاں کی زبان نے اُردو کی تشکیل میں جو کھڑی بولی کی نکھری ہوئی شکل ہے نمایاں حصّہ لیا ہے۔ مرزا غالب کی والدہ اسی شہر آگرے کے ایک معزز گھرانے کی تھیں۔ وہ پانچ برس کے تھے کہ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ ریاست الور میں مارے گئے۔ یتیم ہونے کے بعد ان کی نگرانی ان کے چچا مرزا نصراللہ بیگ خاں کے سپرد ہوئی جو اس وقت مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے گورنر یا صوبے دار تھے۔ جب لارڈ لیک نے مرہٹوں کو شکست دے کر آگرہ پر قبضہ کر لیا تو یہ بے روزگار ہو گئے اور ان کی جگہ ایک انگریز کمشنر مقرر ہو گیا لیکن نواب احمد بخش خاں نے جن کی بہن مرزا نصراللہ بیگ سے منسوب تھیں اور جن کے لارڈ لیک سے دوستانہ مراسم تھے ان کو کہہ سن کر انگریزی فوج میں چار سو سوار کا رسال دار مقرر کر دیا اور دو پرگنے بھی ذات اور سوار کے خرچ کے لیے عنایت ہوئے لیکن ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ نصراللہ بیگ خاں کا بھی انتقال ہو گیا۔ غالب نے یہ ابتدائی زمانہ اپنے چچا کے یہاں نہیں بلکہ نانا کے یہاں گزارا۔ مولانا حالی یادگارِ غالب میں لکھتے ہیں " مرزا عبداللہ بیگ نے بطور خانہ داماد کے اپنی تمام عمر سسرال میں بسر کی اور ان کی اولاد نے بھی وہیں پرورش پائی "۔

افسوس ہے کہ ہمیں غالب کے ابتدائی حالات بہت کم معلوم ہیں۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ ان کی ننھیال بہت آسودہ حال تھی اور آگرہ میں انھیں ہر قسم کی آزادی اور آسائش میسر تھی۔ منشی شیو نرائن کے خط میں انھوں نے اپنے شطرنج کھیلنے اور بلوان سنگھ (مشہور و معروف راجہ چیت سنگھ کے بیٹے)

کے ساتھ پتنگ لڑانے کا ذکر کیا ہے۔ اور مہر نیم روز میں اپنی اس بے ہودہ کوشی اور اوباشی پر اظہار افسوس کیا ہے۔ آہ زعمرے کہ گزشت ایں چنیں۔ تذکرہ سرور میں جو غالب کے قیام آگرہ کے بہت اہم ماخذ میں سے ہے لکھا ہے۔ اسد اللہ خاں اسد عرف مرزا نوشہ، مولدش اکبرآباد، جوان قابل، یار باش، در خاطرش تمکن غم ہائے عشق مجاز، تربیت یافتۂ خم کدہ نیاز، آگرہ میں غالب کا ماحول شاہد و شعر و شراب کا تھا لیکن اس لہو و لعب کے باوجود انھوں نے مروجہ تعلیم بھی حاصل کی اور منطق و فلسفہ ہیئت اور طب میں اچھی خاصی دسترس بہم پہنچالی تھی۔ فارسی سے انھیں مناسبت اصلی تھی۔ تذکرہ گلشن بے خزاں میں لکھا ہے کہ انھوں نے شیخ معظم اور نظیر اکبرآبادی سے بھی درس لیا تھا۔ مرزا غالب نے یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے فارسی کے غوامض ملا عبدالصمد ہرمزسے جو جاماسپ عہد اور بزرجمہر عصر تھا، دو برس تک سیکھے لیکن مولانا حالی کے برخلاف قاضی عبدالودود کا خیال ہے کہ ملا عبدالصمد فرضی نام ہے اور اس کا کوئی وجود خارجی نہیں تھا۔

مرزا غالب کی ننھیال کتنی ہی آسودہ ہو اور ان کے ساتھ کتنا ہی اچھا سلوک کیوں نہ ہوا ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کے والد کی حیثیت خانہ داماد کی تھی اور اس کی وجہ سے گرد و پیش کی جاہ و ثروت کو دیکھ کر ان کے دل میں ایک خاص باطنی خلش ضرور پیدا ہوتی ہوگی۔

تیرہ برس کی عمر میں مرزا غالب کی شادی ذوق کے شاگرد اور نواب احمد بخش خاں کے بھائی مرزا الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی سے ہوگئی اور اس طرح ان کا تعلق دہلی کے ایک ایسے ممتاز گھرانے سے قایم ہوگیا جو نہ صرف دولت مند تھا بلکہ شعر و ادب میں بھی ذی حیثیت تھا۔

غالب پانچ چھ سال کی عمر سے دہلی آتے جاتے تھے لیکن پندرہ سولہ برس کی عمر میں مستقلاً دہلی میں اقامت گزین ہو گئے۔ اس کے بعد بھی آگرہ آنے جانے کا سلسلہ رہا۔ انھوں نے منشی شیو نرائن کو جو خط اپنی پتنگ بازی کے ذکر میں لکھا ہے وہ اٹھارہ انیس برس کی عمر کا ہوا قعہ ہے۔ غالب کے چچا نصراللہ خان کے انتقال کے بعد ان کی پنشن نواب احمد بخش خاں کی جاگیر میں شامل ہو گئی تھی اور وہی ان کے ورثاء کے کفیل بھی تھے۔ دوسرے ان کی بھتیجی سے غالب کی شادی ہو گئی تھی اس لیے وہ آگرہ چھوڑ کر دلّی میں رہنے لگے تھے۔

غالب اس زمانے میں دلّی آئے جب دہلی میں نسبتاً امن چین تھا۔ بقول مولانا حالی "حسن اتفاق سے دارالخلافہ دہلی میں چند اہل کمال ایسے جمع ہو گئے تھے جن کی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری اور شاہ جہانی کی صحبتوں اور جلسوں کی یاد دلاتی تھیں اور جن میں سے بعض کی نسبت مرزا غالب فرماتے ہیں:

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود
باد در خلوت شاں مشک فشاں از دم شاں
مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ
حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شاں
غالب سوختہ جاں گرچہ نیرزد بشمار
ہست در بزم سخن ہم نفس و ہمدم شاں[1]

مولانا حالی نے اس کے بعد لکھا ہے:

"اگرچہ جس زمانے میں کہ پہلی ہی بار راقم کا دلّی جانا ہوا اس باغ میں پت جھڑ شروع ہو گئی تھی۔ کچھ لوگ دلی سے باہر چلے گئے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے مگر جو باقی تھے اور جن کے دیکھنے کا مجھ کو ہمیشہ فخر رہے گا وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دلّی سے

---

[1] یادگار غالب دیباچہ ص۱

بلکہ ہندوستان کی خاک سے پھر کوئی ویسا اٹھتا نظر نہیں آتا"[1]

سرسید نے تذکرہ اہل دہلی میں لکھا ہے:

"ہر ایک شخص ہزار ہزار خوبی کا مجموعہ اور لاکھ لاکھ ہنروں کا گلدستہ ہے۔"

مصر کے مشہور فاضل علامہ رشید رضا کو اعتراف کرنا پڑا کہ اگر ہندی علما علم حدیث کی طرف متوجہ نہ ہوتے تو یہ علم ختم ہو چکا ہوتا۔ ان محدثین میں حضرت شاہ عبدالعزیز کا نام نامی خصوصیت کے ساتھ لائق ذکر ہے۔ ان کا یہ احسان معمولی نہیں ہے کہ انھوں نے انگریزی علوم سیکھنے کی ترغیب دی لیکن اسی کے ساتھ انگریزی تسلط کی مخالفت بھی کی اور اس پورے علاقے کو جو لارڈ لیک کی فتح یابی کے بعد انگریزوں کے زیر نگیں آگیا تھا دارالحرب قرار دیا[2] انھوں نے قومیت کا وسیع تر تصور پیش کیا جس میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کرشن جی عارف باللہ ہیں اور خدا کو پرمیشور کے نام سے بھی یاد کیا جا سکتا ہے[3]

۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے اپنے قدم دہلی میں جما لیے تھے۔ اس دہلی ہی کے متعلق شاہ عبدالعزیز نے لکھا تھا کہ دوسرے شہر اور بلاد کنیزیں اور لونڈیاں ہیں اور دہلی مالک اور رانی۔ یہ موتی اور باقی سب کے سب سیپیاں۔" دہلی مٹنے پر بھی ہندوستان کا دل تھی اور اس کے علما کی راست روی اور غیرت قومی یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ دہلی پر انگریزوں کا تسلط ہو۔ ان کا فتویٰ جہاد نہ مرہٹوں کے خلاف تھا نہ سکھوں کے۔ حالاں کہ ان دونوں طاقتوں کا اثر بہت دور تک پھیل گیا تھا ۱۸۴۵ء میں رنجیت سنگھ کے مرنے کے بعد

---

[1] یادگار غالب طبع علی گڑھ ص۱ [2] فتاویٰ عزیزی: حیدرآباد ۱۳۲۲ھ ص۵۲

[3] اکرام عزیز احمد

انگریزوں نے پورے پنجاب پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد جہادی تحریک کا رخ کلیتاً انگریزوں کے خلاف ہو گیا اور ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۳ء تک انگریزوں نے بیس دفعہ ۶۰ ہزار لشکر کی مدد سے جہادیوں کا مقابلہ کیا لیکن یہ تحریک کچلی نہیں جا سکی۔

وہابی علما کی تمام تر سعی یہ رہی کہ اسلام کو خارجی عناصر سے پاک کیا جائے لیکن وہ ہندوؤں سے اتحاد کرنے اور ان سے مدد لینے کے دل سے حامی تھے۔ ان کی رواداری اور اتحاد پسندی کا یہ اثر تھا کہ ہندو مہاجن، ہندو راجہ۔ ہندو تحصیل دار۔ ہندو سامعین اور ہندو مترجمین سب ان کی خاموش تائید کرنے والوں میں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان کو ہندوؤں کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو ان کی جہادی تحریک ہگلی سے ساور تک اور سرحد سے کرنول تک نہ پھیلتی۔ اس لیے کہ مجاہدین کی تمام تر مدد ان ہی علاقوں سے گزر کر جا سکتی تھی۔

مرزا غالب کو نہ وہابیوں سے خصومت تھی اور نہ ان کے مخالفوں سے کچھ تعلق تھا۔ ان کے دوستوں میں خاتم العلما مولانا فضل حق خیرآبادی بھی تھے جنھوں نے غالب کو طرز بیدل کی پیروی سے نجات دلائی۔ رام پور سے ان کا تعلق استوار کروایا اور جو وہابی تحریک کی مخالفت کے ساتھ انگریزی حکومت کے بھی سخت مخالف تھے۔ انھوں نے بہادر شاہ کے لیے دستور العمل سلطنت مرتب کیا تھا جس میں گاؤکشی کی ممانعت تھی اور ہندو مسلم اتحاد پر زور تھا[1] ان کو حکم دوام حبس ہوا اور ۱۸۶۱ء میں رنگون میں انتقال فرمایا۔

وہابی تحریک مذہبی بھی تھی، سیاسی بھی، ادبی بھی ــــ اس تحریک

---

[1] مہدی حسن

نے وہ آزادی جرأت اور بے باکی پیدا کی جو اس سے پہلے اُردو ادب میں نہیں ملتی۔ وہابی علما اور مرزا غالب کے راستے الگ تھے لیکن جس آزادی اور بے باکی سے ان علما نے مذہب رسوم اور معاشرت میں تقلید کے خلاف جہاد کیا اور اصنام خیالی کو توڑا اسی آزادی سے مرزا غالب نے فن لغت اور فن شعر میں بڑے بڑے استادوں پر نکتہ چینی کی ہے اور اس بات پر زور دیا کہ اگلے جو کچھ کہہ گئے ہیں وہ وحی اور الہام نہیں ہے اور نہ ہر پُرانی لکیر صراط مستقیم ہے۔

مولانا حالی اس بات پر متفق ہیں کہ سرسید میں بھی جو آزادیٔ خیال اور جرأت گفتار ہے اس کا سرچشمہ بھی وہابی علما کی تحریریں اور تقریریں ہیں۔

غالب کے معاصر اور حضرت شاہ عبدالعزیز کی مجالس وعظ کے حاشیہ نشیں مومن کوچۂ رقیب میں سر کے بل جانے کے لیے تیار ہیں اور شبِ وصلِ غیر کاٹنے کے لیے آمادہ لیکن جب وہ عام سطح سے بلند ہوتے ہیں تو اتنے کہ غیر ملکی حکومت کے خلاف جہاد کو اصل ایمان اور اپنی جان کو اس راہ میں صرف کر دینے کو سب سے بڑی عبادت سمجھتے ہیں۔ مرزا غالب کو بھی حسرت رہی کہ وہ جہادی قافلوں میں شریک ہو سکتے اور ان کے دوش بدوش لڑ سکتے لیکن جس طرح ان کی مثنوی امتناع نظیر خاتم النبیین محض ایک ادبی لطیفہ ہے اسی طرح ممکن ہے کہ یہ آرزو بھی شاعرانہ اسلوب سے زیادہ نہ ہو لیکن اس وقت بلاشبہ پوری دلی اس تحریک سے مسحور تھی اور ان وہابی مقررین اور مصنفین کی خوش گفتاریوں کے آگے بہت سے چراغ مدھم پڑ گئے تھے۔

شاہ عبدالعزیز زبان دانی کے ماہر تھے۔ ان کے بھائی حضرت شاہ عبدالقادر نے قرآن پاک کا اُردو ترجمہ کیا اور اس میں "زبان ریختہ نہیں بولی بلکہ ہندیٔ متعارف" استعمال کی ہے "تاکہ عوام کو بے تکلف دریافت ہو"۔

ان علما کی کوششوں سے صاف اور سلیس زبان کا رواج ہوا جس کی بہترین شکل ہمیں ذوق و ظفر کی شاعری میں اور مرزا غالب کے خطوں اور

رقعوں میں ملتی ہے ۔ نادر شاہ کا ایلچی جب دہلی آیا تو کہا جاتا ہے کہ محمد شاہ
کے منشیوں نے تین برس اس سوچ میں صرف کر دیے تھے کہ شاہ ایران کو کیا
القاب لکھا جائے۔ اس وقت القاب و آداب مقرر تھے اور تمام اوصاف اسم
تفضیل کے صیغے میں لکھے جاتے تھے لیکن جب نئی مزدوروں کی صبح طلوع ہوئی
تو یہ تکلفات بھی ختم ہو گئے ۔ غالب نے جدید نثر کی طرح ڈالی اور سرسید آدم
نثر جدید کہلائے ۔

شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالعزیز دونوں خواجہ میر درد کے شاگرد
تھے ان کا تصوف انسان دوستی کے آفاق گیر تصور پر مبنی ہے۔ مرزا مظہر جانِ
جاناں تو ہندوؤں کو موحد اور صاحبِ کتاب سمجھتے تھے [1] غالب کے یہاں بھی
"اصل چیز عقیدے سے وفاداری ہے ۔ ملتیں اہم نہیں۔ ان کے ملنے سے
جو ایمان بنتا ہے وہ اہم ہے ۔ ان کی انسانیت کے دائرے میں دیر و حرم اور
زنار و تسبیح کا فرق موجود نہیں ہے ۔ یہی لے خطوں میں بھی ہے لکھتے ہیں:

"میں تو بنی آدم کو، مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی ، عزیز رکھتا ہوں
اور بھائی گنتا ہوں "

پروفیسر گب نے لکھا کہ جب کبھی تہذیب کو کوئی خطرہ لاحق ہوا ہے تو تصوف
نے اس کو اتنی توانائی بخشی ہے کہ وہ مغلوب نہیں ہو سکی [2]

انیسویں صدی کو عام طور پر زوال کا زمانہ سمجھا جاتا ہے ۔ سیاسی انحطاط
سے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے لیکن ہماری تہذیب کو ابھی گھن نہیں لگا تھا جہادی
تحریک اور تصوف کے نئے مثبت رجحانات اس بات کے گواہ ہیں کہ اس وقت
دلّی اپنی روایات سے بیگانہ اور روحانی اور اخلاقی ورثے سے بے بہرہ

---

[1] کلیات طیبات طبع آگرہ ۱۹۱۴ ص ۳۷ ــ ۴۴

نہیں تھی۔

مشکاف نے لکھا ہے کہ دہلی میں یہ شوق جہاد اتنا بڑھ گیا تھا کہ بہت سے لوگوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجی اور شہری ملازمتوں سے استعفےٰ دے دیے تھے اور اپنے گھروں سے سربکف نکل کھڑے ہوئے۔ یوں بھی اس زمانے میں علما اور ثقافت کمپنی بہادر کی ملازمت کو "حمالی" اور عزت و افتخار سے گرا ہوا سمجھتے تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز، میر تقی میر، مرزا غالب اور مومن خاں مومن ــــــ کسی نے بھی انگریز کی ملازمت قبول نہیں کی۔ شاہ غلام علی خانقاہ والے تو کہتے تھے کہ ان سب کا وسیلۂ معیشت مشتبہ ہے۔ سرسید نے نذر پیش کی تو خانقاہ کے تمام مشائخ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

مومن شاہ عبدالقادر کے شاگرد اور مولانا سید احمد بریلوی کے مرید تھے۔ ان کی شادی دہلی کے نامور خاندانِ ارشاد و ہدایت یعنی خواجہ میر درد کے گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس لیے خوشامد اور تملق سے پرہیز کرتے تھے اور قصیدہ کو کارِ ہوس پیشگاں سمجھتے تھے۔ وہ رند غزل خواں بھی ہیں۔ اور جہاد کے علم بردار بھی۔ عروج شہید و صدیق بھی چاہتے ہیں اور محبوب کی نگاہ بے حجاب بھی۔ وہ مثنوی جہادیہ بھی لکھتے ہیں اور مثنوی قول غمیں بھی۔ یہ تضاد مومن ہی میں نہیں اس زمانے کی زندگی میں بھی تھا۔ وصل شاہدان شیریں کے جو تقاضے حرم میں پورے نہیں ہو سکتے تھے وہ دیوان خانے میں پورے ہوتے تھے۔ اس دور میں ایک مناجان، ایک درگاہائی صنم۔ ایک رجو۔ ایک صاحب جی برابر ملتی ہیں اور رندی و زہد میں وہ بیر نہیں تھا جو آج ہے۔

غالب مومن کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان کے ایک شعر پر اپنا پورا دیوان نثار کرنے کو تیار تھے۔ ان کے مرنے پر غالب نے لکھا تھا ؎

کافر باشم اگر بہ مرگ مومن
چوں کعبہ سیہ پوش نباشم عمر

سر سید نے مومن کو "یگانۂ جہاں" لکھا ہے۔ نواب مصطفےٰ خاں حسرتی و شیفتہ ان کے شاگردوں میں تھے۔ اور شیفتہ کے متعلق مولانا حالی کی رائے ہے:

"لوگ ان کے مذاق کو شعر کے حسن و قبح کا معیار جانتے تھے۔ ان کے سکوت سے شاعر کا شعر خود اس کی نظر سے گر جاتا تھا اور ان کی تحسین سے اس کی قدر بڑھ جاتی تھی" [1]

اور خود غالب کا فتویٰ ان کے متعلق یہ تھا ؎

غالب بہ فن گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیواں غزل تا مصطفےٰ خاں خوش نکرد

مومن کے انتقال کے بعد شیفتہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں مرزا غالب سے مشورہ سخن کرتے رہے۔ دونوں میں بڑی دوستی اور محبت کے تعلقات تھے۔ جب مرزا غالب ۱۸۴۷ء میں جوئے کے الزام میں قید ہوئے تھے تو شیفتہ ہی نے ان کی مدد کی تھی۔ فرماتے ہیں:

خود چراں خوں نورم از غم کہ بہ غم خوارئ من
رحمتِ حق بہ لباس بشر آمد، گوئی
خواجۂ ہست دریں شہر کہ از پرسش ئے
بایہ، تولیشتنم در نظر آمد، گوئی
مصطفےٰ خاں کہ دریں واقعہ غم خوار من است
گر بمیرم، چہ غم از مرگ، عزادار من است

---

[1] یادگار غالب

فرد کا تعلق طبقہ سے ہے اور طبقہ کا دامن اس کے سماج سے بندھا ہوا ہے۔ غالب کی اچھائیوں اور کمزوریوں کو بھی اسی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ شاہد و شمع و مے و قمار سے ان کا تعلق کوئی چھپی ڈھکی بات نہیں۔ قمار بازی کے الزام میں وہ ایک دفعہ نہیں دو دفعہ معتوب ہوئے۔ ۲۲ر اگست ۱۸۴۱ء کے دہلی اُردو اخبار میں لکھا ہے:

"سنا گیا ہے کہ ان دنوں تھانہ گزر قاسم خاں میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز پکڑے گئے مثل ہاشم علی خاں وغیرہ کے کہتے ہیں بڑا قمار ہوتا تھا۔ تھانیدار قوم سے سید ...... مرزا نوشہ ایک شاعر نامی اور رئیس زادہ۔ نواب شمس الدین خاں قابل ولیم فریزر صاحب کے قرابت قریبہ میں سے ہے ..... اس نے دیانت کو کام فرمایا۔ سب کو گرفتار کیا۔ عدالت سے جرمانہ علی قدر مراتب ہوا۔ مرزا نوشہ پر سو روپے۔ نہ ادا کریں تو چار مہینہ قید۔"

مئی ۱۸۴۷ء کا واقعۂ اسیری اس کے بعد کا ہے۔ جس کے متعلق منشی کریم الدین نے لکھا ہے:

"ان ایام میں یعنی درمیان ۱۸۴۷ء کے، ایک حادثہ ان پر جانب سرکار سے بڑا پڑا۔ جس کے سبب ان کو بہت رنج لاحق حال ہوا۔ عمر اُن کی اس میں قریب ساٹھ برس کی ہوگی۔"[1]

لیکن ان واقعات اسیری سے غالب کی شاعرانہ عظمت میں کچھ فرق نہیں آتا۔ ان کی عظمت کے گوشے وہاں روشن ہوتے ہیں جہاں وہ شخصیت اور گرد و پیش سے گزر کر تاروں کو چھو لیتے ہیں اور کائنات کی وسعتوں میں پہنچ جاتے ہیں۔

شیفتہ بڑے خوش فکر شاعر تھے اور نقد شعر میں بھی امتیاز رکھتے تھے۔

---

[1] تذکرہ کریم الدین ص ۳۷۸

ان کا تذکرہ گلشن بے خار میانہ روی اور اعتدال و توازن کے لیے مشہور ہے۔ ان کو ۱۸۵۷ء میں غیر معمولی مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کا قیمتی کتب خانہ جل گیا۔ مکانات کو آگ لگا دی گئی اور انگریزوں نے اعانت مجرمانہ کے الزام میں ان کی جاگیر ضبط کر لی اور سات برس کی سزا دی۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مصطفٰے خاں کا حال سنا ہوگا۔ خدا کرے مرافعہ میں چھوٹ جائے ورنہ حبس ہفت سالہ کی تاب اس ناز پروردہ میں کہاں"

شیفتہ خوش قسمتی سے اپیل میں بری ہو گئے۔ غالب جن کی کوششوں سے شیفتہ کو رہائی ملی تھی ان سے ملنے میرٹھ گئے۔ جائیداد کی واگزاری میں بھی ان کا ہاتھ تھا۔ شیفتہ صبر و رضا کی دولتِ خاص سے بہرہ مند تھے۔ مالک رام صاحب نے ان کے ضبط و استقلال کے دو عجیب واقعات لکھے ہیں۔ جس زمانہ میں وہ قید میں تھے، پاپیادہ، بیڑی پہنے ایک سڑک سے گزر رہے تھے اس وقت آسمان کی طرف دیکھ کر فرمانے لگے: "تیری شان کریمی کے قربان۔ اتنی ہی سزا دی، ورنہ میں تو اس سے بہت زیادہ کا مستحق تھا"

دوسرا واقعہ انھوں نے منشی ذکاء اللہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ شیفتہ کو سرطان ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے عمل جراحی تجویز کیا۔ وہ آتا اور ناقص گوشت کاٹ کاٹ کے الگ کر دیتا۔ دیکھنے والوں کے دل ہل جاتے لیکن ان کے ماتھے پر شکن تک نہ آتی۔ ایک دن بڑے صاحبزادے محمد علی خاں بے اختیار رونے لگے تو فرمایا "اس جسم خاکی کے زوال پر رونا بڑی کم ہمتی ہے"

مفتی صدرالدین آزردہ نے جو خود ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں چند در چند مصائب کا شکار ہوئے تھے، اپنے مرثیۂ دہلی میں شیفتہ اور صہبائی کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ ثانی الذکر کے جسم کو توپ سے باندھ کر ان کے پرخچے اڑا

لے مالک رام: تلامذۂ غالب ص۱۸۲

دیے گئے تھے۔ آزردہ لکھتے ہیں ؎

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے
سر ہے اور جوشِ جنوں، سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر، جی ہی پہ بن آتی ہے
مصطفیٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے
کیوں کہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو[1]

غالب اور سرسید کے دوست فاضل عصر مولانا امام بخش صہبائی دلی کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ بغاوت کے الزام میں ان کی جو دردناک موت واقع ہوئی اس پر سفینۂ رحمانی میں جو مرثیہ کے اشعار درج ہیں ان کو پڑھ کر آج بھی درد کی ایک ٹیس پیدا ہو جاتی ہے ؎

ندانم کجا رفت آں نقش پاک — ملک بُرد یا ماند بر روئے خاک
ندانم کہ داد اورا کفن — ویا ماند چوں سایہ برخاک تن
بخاکش نمودند اورا نہاں — ویا مرتفع شد سوی آسماں
کہ فاتحہ ہم بر وخواندہ است — بعطر گلابی برافشاندہ است
الٰہی بیا مرز مظلوم را — کلاہ شہی دہ بہ ملک بقا

مفتی صدرالدین آزردہ فارسی اور اردو کے بلند پایہ شاعر اور عربی کے زبردست عالم تھے۔ جرم بغاوت میں بقول غالب "بہت دیر حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبانِ کورٹ نے جاں بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف۔ جائیداد ضبط۔ لیفٹیننٹ گورنر نے ازراہ ترحم نصف جائیداد واگزاشت کی۔"

---

[1] انقلاب دہلی مرتبہ نظامی بدایونی طبع ۱۹۳۱ء ص۳

مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے "مفتی صاحب کا دیوان خانہ دہلی کے منتخب افراد کا مجمع و مرکز تھا۔ جاڑا گرمی برسات کوئی موسم ہو لیکن شب کی مجلس کوئی قضا نہیں کرتا تھا۔ ہر فن کے اکابر کو وہاں ان کے بہترین وقتوں میں دیکھا جا سکتا تھا۔ اگر کوئی نو وارد دہلی آتا اور چاہتا کہ دہلی کے سارے فضل و کمال کو بیک مجلس دیکھ لے تو وہ سیدھا مفتی صاحب کے دیوان خانہ کا رخ کرتا"۔[1]

اس زمانے میں اکثر مشاعرے ہوتے اور ان میں فارسی اُردو غزلیں پڑھی جاتیں۔ غالب سب میں تو نہ جاتے لیکن جن مشاعروں کا انتظام نواب ضیاء الدین خاں کرتے ان میں اصرار سے چلے جاتے۔ انھوں نے ایک قصیدہ عرفی کے طرز میں اور گریستن کی ردیف اور جناب سید الشہدا کی منقبت میں لکھا تھا۔ اس مشاعرہ میں نہ ممنون تھے اور نہ صہبائی۔ مرزا کو تامل رہا کہ فارسی کا قصیدہ ہے پڑھیں نہ پڑھیں بلکہ " در یختہ گویان را در دسر ندہم "۔ اتفاق سے مفتی صدر الدین آزردہ آ گئے۔ غالب لکھتے ہیں: " از آمدنِ حضرت آزردہ دل بخود بالیدو زمزمۂ دستوری یافت "۔ مولانا حالی کا بیان ہے کہ مرزا کی پُر درد آواز سے مجلس مشاعرہ مجلس عزا بن گئی اور جب تک قصیدہ پڑھا گیا لوگ برابر روتے رہے۔ اتفاق سے مینھ برسنے لگا۔ مفتی صاحب نے فرمایا " آسماں ہم گریست "۔

یہ صحبتیں ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں درہم برہم ہو گئیں اور دلی بیواؤں سے زیادہ دکھیاری ہو گئی ؎

چمن کے تخت پر جس دن شہ گل کا تجمل تھا
ہزاروں بلبلوں کی فوج تھی اک شور تھا، غل تھا
خزاں کے دن جو دیکھا کچھ نہ تھا جز خار گلشن میں

---

[1] غلام رسول مہر: غالب صفحہ ۲۹ اضافہ از مولانا ابوالکلام آزاد

بتاتا باغباں رورو یہاں غنچۂ یہاں گل تھا

جس زمانے میں مرزا غالب دہلی آئے ہیں یہاں انگریزی نظم و نسق قایم ہو چکا تھا اور گوشہ میں قفس کے کچھ آرام اور اطمینان بھی تھا۔ تہذیبی زندگی کا شیرازہ جو منتشر ہو گیا تھا، وہ ایک دفعہ پھر بندھ گیا تھا اور اسی کے نتیجے میں وہ وہ نما میسر آئے جنھوں نے عہد جدید کی گزرگاہوں کو روشن کر دیا اور ہمیں ایک نئی سادہ زبان۔ ایک نیا ادب۔ نئے اصول نقد۔ ایک نیا نظام تعلیم اور مذہب اور تہذیب کی مدافعت کے نئے ہتھیار دیے۔ ہم نے مغرب کے آگے فوراً سپر نہیں ڈال دی بلکہ آویزش اور پیکار سے لے کر افہام و تفہیم اور مفاہمت و مصالحت کی تمام منزلیں طے کیں۔ یہ غلط فہمی عام ہے کہ انیسویں صدی میں ہندوستان علم وفن سے بیگانہ تھا اور اس پر زوال اور نکبت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا لیکن یہ پوری صداقت نہیں ہے۔ کرنل سلیمن نے لکھا ہے:

"دنیا میں ایسی قومیں کم ہوں گی جن میں تعلیم اس قدر عام ہے جس قدر ہندوستان کے مسلمانوں میں۔ یہاں سات سال کے درس کے بعد طالب علم کے دستار فضیلت باندھی جاتی ہے اور وہ اسی طرح سقراط، ارسطو، افلاطون، بقراط، جالینوس اور بو علی سینا کے متعلق گفتگو کر سکتا ہے جس طرح آکسفورڈ کا ایک طالب علم۔"

مرزا غالب کی دہلی میں علما میں شاہ عبدالعزیز اور مولانا فضل حق خیرآبادی اطبا میں حکیم محمود خاں اور حکیم احسن اللہ خاں اور شعرا میں مومن و شیفتہ اور ذوق و ظفر موجود تھے اور ان میں سے ہر ایک کی حیثیت فرد کی نہیں ادارے کی تھی۔

غالب بھی اس عہد کے صاحب نظر دانشوروں میں تھے۔ وہ آگرہ کے خم کدۂ نیاز سے نکل کر دلی آئے تو یہاں شاعروں سے معرکہ آرا ہوئے

انھوں نے ذوق کی لسانی تحریک کو مانا لیکن اسے حکیمانہ نظر بھی دی۔ کلکتہ گئے تو وہاں حامیانِ قتیل سے بر سرِ پیکار ہوئے اور اس ایرانی ہندی نزاع میں کود پڑے۔ جو فیضی اور عرفی شیخ علی حزیں اور خان آرزو کے زمانے سے جاری تھی۔ مرزا نے اس میں بھی سرگرم حصہ لیا اور بعض ایرانیوں سے خراج تحسین حاصل کیا۔ پھر ان کی پنشن کا قصہ اٹھ کھڑا ہوا جس میں وہ پورے تیس برس تک الجھے رہے۔ انھوں نے انگریزوں کی خدمت میں قصیدے بھیجے جو دراصل منظوم عرضیاں ہیں اور ان کو اس زمانے کے مروجہ طریقوں ہی کی نظر سے دیکھنا چاہیئے یہاں بھی سوال ثنا گوئی اور مدح گستری یا جیغہ و سرپیچ اور مالائے مروارید سے زیادہ خاندانی حق اور وجاہت کا تھا جس کو وہ کسی قیمت پر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

۱۸۰۶ء میں شاہ عالم کا انتقال ہوگیا۔ ان کے مرنے کے بعد اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوئے۔ انگریزوں نے بہت کوشش کی کہ بادشاہ کے اعزاز و احترام میں کمی آجائے اور شاہی خاندان کو قطب میں منتقل کر دیا جائے لیکن اکبر شاہ اپنے موروثی حقوق پر اڑے رہے۔ ۱۸۱۴ء میں جب گورنر جنرل کلکتہ سے دہلی آئے تو بادشاہ نے ان کو اپنے قریب کرسی دینے سے انکار کر دیا اور پھر آداب و نیاز کا یہ سلسلہ ہی منقطع ہوگیا۔

۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ ثانی کا انتقال ہوگیا اور ان کے بعد بہادر شاہ ظفر تخت نشین ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر ساٹھ برس کی تھی لیکن وہ انگریزوں کی نظر میں بری طرح کھٹکتے تھے۔ انھوں نے باوجود بے بسی اور پیرانہ سالی کے بچی کچی شاہی عظمت کو قایم رکھا اور اس پر آنچ نہیں آنے دی۔ انھوں نے اس پر اصرار کیا کہ انگریز جوتے اتار کر ان کے حضور میں حاضر ہوں لیکن انگریز ان پر طرح طرح کے ظلم کرنے پر تلے ہوئے تھے اور ان کی معاشی حالت کو کمزور کرنے کے درپے تھے۔ لارڈ ایلن برا نے

نے عیدین۔ نوروز اور سالگرہ کے موقع پر نذر پیش کرنا بند کر دی۔ ۱۸۴۸ء میں لارڈ ڈلہوزی دہلی آیا اور مارے غرور کے بادشاہ کے حضور میں سلام کو حاضر نہیں ہوا۔ ۱۸۵۶ء میں زبردستی یہ طے ہوا کہ بہادر شاہ ظفر کے بعد جو بھی تخت نشین ہوگا وہ لال قلعہ میں نہیں رہے گا۔ اس کو بادشاہ کے بجائے شہزادہ کے لقب سے یاد کیا جائے گا اور وہ پندرہ ہزار روپے ماہوار کی معمولی پنشن کے ساتھ قطب صاحب میں زندگی بسر کرے گا لیکن ایک ہی سال کے اندر بغاوت ہوئی وآں دفتر را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب برد

مرزا غالب کی شادی ذوق کے شاگرد نواب الٰہی بخش خاں معروف کی لڑکی سے ہوئی تھی جن کے تعلقات دہلی کے نامور شاعروں اور امیروں سے بہت گہرے تھے۔ غالب کو بھی ان محفلوں میں درخور حاصل ہوا اور وہ ان صحبتوں سے پوری طرح فیض یاب ہوئے۔ ذوق کا سکہ صرف معروف ہی کے یہاں نہیں۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں بھی چل رہا تھا۔ غالب کے کلام میں جو سہل ممتنع کا رجحان اور زبان و بیان کے کرشموں کی طرف توجہ ملتی ہے وہ بھی اسی دبستان کا اثر ہے۔

۴ جولائی ۱۸۵۰ء کو بہادر شاہ ظفر نے حکیم احسن اللہ خاں کی سفارش پر غالب کو نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے خطابات دیئے اور پچاس روپے ماہوار پر شاہانِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے کی خدمت سپرد کی۔

۱۶ اکتوبر ۱۸۵۴ء کو استادِ شہ خاقانی ہند ذوق کا انتقال ہوگیا۔ چنانچہ بادشاہ کے اشعار کی اصلاح بھی ان کے سپرد ہوئی لیکن ملک الشعرا یا اس طرح کا کوئی خطاب نہیں ملا۔ ظفر و غالب کے انداز و اسلوب میں بڑا فرق ہے اور وہ ان دونوں کے دیوانوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ بہادر شاہ کا سہارا بہت کمزور تھا۔ یہ چراغ معلوم نہیں کب بجھ جائے۔ ۱۸۵۲ء میں بہادر شاہ بیمار ہوئے۔ اس وقت غالب کو اپنے مستقبل کی

طرف سے فکر ہوئی اور انھوں نے منشی ہیرا سنگھ کو لکھا:

"از شبِ عید خاقان رنجور است۔ حالا دیگر چہ رونماید و بمن کہ در سایۂ دیوارش غنودہ ام، چہ رود۔"

۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو بغاوت شروع ہو گئی اور اس کے شعلوں نے دہلی اور پورے اکناف ہند کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

مولانا غلام رسول مہر نے لکھا ہے "یوں تو غالب کے الم نامہ حیات کا کوئی ورق بھی ایسا نہیں جس کے بین السطور کی آرائش میں دل و جگر کا خون بے دریغ صرف نہ کیا گیا ہو لیکن اس جلیل القدر انسان کے اندوہ و ماتم کا سب سے بڑھ کر دردناک باب سلطنتِ تیموریہ کے زوال کا وہ خوں چکاں واقعہ ہے جو عام طور پر "غدر" کے نام سے معروف ہے۔" [1]

غالب نے اس تہذیب کا مرثیہ بڑے پُر درد الفاظ میں پیش کیا ہے اور رمزی علامتوں کے پیرایہ میں ساری خارجی حقیقتوں کو سمو لیا ہے ؎

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز، نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

۱۸۵۷ء کی بغاوت پر اتنی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ ایک اچھا خاصہ کتب خانہ

---

[1] مہر: غالب ص ۲۳۶

تیار ہو سکتا ہے لیکن اس دہلی کے حالات کا بہترین ماخذ غالب کا روزنامچہ دستنبو، ان کے خطوط اور وہ اشعار ہیں جن میں ان کے دل کی تمام دھڑکنیں سنی جا سکتی ہیں۔

غالب نے دستنبو میں انسانی نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس نے انگریزوں پر جو مظالم ہوئے ان کو بیان کیا ہے اور لکھا ہے "ہیچ مشت خاکے نماند کہ از خونِ گل اندامان ارغوان زار نشاد" لیکن اسی کے ساتھ باغی دوستوں اور شکستہ خوردہ امیروں کی تکلیفوں سے بھی چشم پوشی نہیں کی۔ غالب کی مجبوریوں کے پیشِ نظر اس روزنامچے کو بین السطور میں پڑھنا چاہیئے۔ اس لیے کہ غالب نے جابجا صنعت طرازی سے کام لیا ہے اور عبارت کی تہوں میں اپنے مطالب کو چھپایا ہے۔

دستنبو کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں عوام شریک تھے اور یہ صرف فوجیوں کا برپا کیا ہوا ہنگامہ و آشوب نہیں تھا۔ عوام نے آخری وقت تک دلیرانہ اور مدافعانہ جدوجہد کی اور اجمیری دروازہ اور ترکمان دروازہ یہ سب رزم گاہ میں تبدیل ہو گئے تھے۔ دہلی اب شہر خموشاں میں تبدیل ہو گیا تھا اور پوری مسلمان آبادی شہر بدر کر دی گئی تھی "شہر از مسلمانان تہی است شبانہ خانہ ہائے ایں مردم، بے چراغ اور روزانہ، روزنِ دیوارہا بے دود"۔

دستنبو لکھنے کا مقصد اپنی بے گناہی ثابت کرنا اور خلعت و خطاب اور پنشن کی درخواست کرنا تھا۔ پھر بھی اس کا ایک بڑا حصہ ان تکالیف کے بیان پر مشتمل ہے جو فتح دہلی کے بعد مرزا غالب اور ان کے عزیزوں اور دوستوں کو پیش آئیں اور جن کو انھوں نے بڑے پرسوز انداز میں قلم بند کیا ہے۔ غالب نے آئینہ کو ایک خاص رخ سے پکڑا ہے اور پہلی دفعہ ہندوستانیوں کے مصائب کو غیر ملکی حکمرانوں کے سامنے رکھا ہے۔

غالب اس غدر کے ہنگامہ میں مع زن و فرزند، قلزم خون کے شناور

رہے اور انھوں نے دروازہ سے باہر قدم نہیں رکھا لیکن یہ اتنا بڑا انقلاب تھا کہ اس کے بیان کرنے کے لیے کوئی مناسب لفظ نہیں ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ہزارہا دوست مر گئے۔ کس کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں۔ جیوں تو کوئی غمخوار نہیں۔ مروں تو کوئی عزادار نہیں۔"

مرزا ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

"صاحب تم جانتے ہو کہ یہ کیا معاملہ ہے اور کیا واقعہ ہوا۔ وہ ایک جنم تھا جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت در پیش آئے۔ شعر کہے۔ دیوان جمع کیے۔ اس زمانے میں ایک بزرگ تھے اور ہمارے تمھارے دلی دوست تھے۔ منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر ان کا تخلص۔ نہ وہ زمانہ رہا۔ نہ وہ اشخاص۔ نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط۔ نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے یعنی ایک خط میں نے منشی صاحب کو بھیجا اس کا جواب آیا۔ ایک خط تمھارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو اور میں جس شہر میں رہتا ہوں اس کا نام دلی اور اس محلے کا نام بلی ماران کا محلہ لیکن ایک دوست، اس جنم کے دوستوں سے نہیں پایا جاتا۔"

مرزا غالب نے اپنے خطوں میں بار بار اور بالجہر اپنی بے گناہی اور باغیوں سے بے تعلقی ظاہر کی ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے۔ دربار میں حاضر

ہوتے تھے۔ انھوں نے بہادر شاہ کی خدمت میں سکّہ شعر بھی پیش کیا تھا۔ اور فتح آگرہ کی خوشی میں ایک قصیدہ بھی پڑھا تھا۔ اس لیے ان کی بے گناہی کو بعض نئی شہادتوں کی روشنی میں قبول نہیں کیا جا سکتا۔ غالب نے حسین مرزا کو جون ۱۸۵۹ء کے خط میں لکھا ہے:

"یہاں ایک اخبار جو گوری شنکر یا گوری دیال یا کوئی اور، غدر کے دنوں میں بھیجتا تھا اس میں ایک خبر اخبار نویس نے یہ بھی لکھی فلاں تاریخ اسد اللہ خاں غالب نے یہ سکہ کہہ کر گزرانا ہے

بہ زر زد سکۂ کشور ستانی سراج الدین بہادر شاہ ثانی

مجھ سے عند الملاقات صاحب کمشنر نے پوچھا کہ یہ کیا لکھتا ہے میں نے کہا کہ غلط لکھتا ہے۔ بادشاہ شاعر۔ بادشاہ کے بیٹے شاعر۔ خدا جانے کس نے کہا اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا۔"

یوسف مرزا کو لکھتے ہیں:

"میں نے سکّہ کہا نہیں۔ اور اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا یہ گناہ نہیں اور گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے۔ سبحان اللہ گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعر کے دو مصرع معاف نہ ہوں۔"

سوال یہ ہے کہ غالب کے وہ مصرعے کون سے تھے۔ تھے بھی یا نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ جو سکے غالب سے منسوب کیے گئے وہ درحقیقت ان کے نہیں تھے اور اس معاملے میں ان کا اضطراب بجا تھا۔ لیکن انھوں نے سکہ بھی کہا تھا اور قصیدہ بھی گزرانا تھا۔ اس طرح باغیوں سے اخلاص کی بات بالکل نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔

غالب کا سکہ منشی جیون لال نے پیش کیا ہے۔ اس روزنامچہ کا انگریزی ترجمہ

مٹکاف نے کیا تھا اور سخن فہمی، عالم بالا کا حال یہ ہے کہ سکہ شعر کا ترجمہ اشرفی کیا ہے اور اس انگریزی ترجمہ کا اُردو ترجمہ غدر کی صبح وشام میں موجود ہے لیکن مٹکاف کا ترجمہ غلط ہے اور اُردو ترجمہ غلط در غلط ہے۔ حسن اتفاق سے میں نے انگلستان کے قیام میں جیون لال کے اصل اردو روزنامچہ سے استفادہ کیا ہے۔

اس میں انیسویں مئی ۱۸۵۷ء کے ذیل میں جیون لال نے لکھا ہے:

"دربار شاہی منعقد ہوا۔ مولوی ظہور علی تھانہ دار نے حاضر ہوکر ایک سکۂ جلوس در بابت تخت نشینیٔ حضور گزرانا۔ اس پر اور شاعروں نے بھی سکے کہے۔"

تین سکے لکھنے کے بعد جیون لال نے مرزا غالب کا یہ شعر، سکہ شعر مرزا نوشہ کے عنوان سے پیش کیا ہے جو خود پکار کر یہ کہہ رہا ہے کہ اس کا مصنف غالب کے سوا اور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ ؎

بر زر آفتاب و نقرۂ ماہ
سکہ زد در جہاں بہادر شاہ

غالب نے ایک قصیدہ بھی ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے زمانے میں اور فتح آگرہ کی خوشی کے موقع پر پیش کیا تھا۔ منشی جیون لال نے ۱۳ جولائی ۱۸۵۷ء کے ذیل میں لکھا ہے:

"فتح آگرہ کے مژدے سے سب بادشاہ اور اہل قلعہ خوش تھے مرزا نوشہ اور مکرم علی خاں نے ایک قصیدہ من تصنیف خود ہا بادشاہ کی طرح میں پڑھے۔"

جیون لال کے اس بیان کی تائید آگرہ کے اخبار عالم تاب سے بھی ہوتی ہے۔ اس میں لکھا ہے:

"مرزا نوشہ اور مکرم علی خاں نے ۱۳ جولائی ۱۸۵۷ء کے دن بہادر شاہ کی تعریف میں قصیدے پڑھے۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ غالب نے عوامی بغاوت کے زمانہ میں بہادر شاہ ظفر سے تعلقات منقطع نہیں کیے تھے۔ اس سے ان کی غیرت قومی اور بادشاہ کی ہر دل عزیزی دونوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ نے لکھا ہے کہ ملک میں ہر شخص بادشاہ کی غیر معمولی عزت اور احترام کرتا ہے اور ہندوستان کے تمام لوگ ان کو اپنا جائز آقا اور فرماں روا سمجھتے ہیں[1]

اور واقعہ بھی یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر نے انگریز سے لڑائی ضرور لڑی تھی لیکن نہ کوئی بد عہدی کی تھی اور نہ کوئی غداری اور بغاوت کی تھی۔ اس نے تو صرف اس حق پر اصرار کیا تھا جو اس کو گیارہ پشتوں سے ملتا چلا آیا تھا۔ انگریزوں نے جو اس پر دیوان خاص میں ۴۲ دن تک مقدمہ چلایا وہ بھی صریحاً بے انصافی تھی اور قید و بند میں جو مظالم کیے وہ بھی کسی طرح معاف نہیں کیے جا سکتے۔ رنگون میں قید تنہائی تھی کوئی پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ جب بیماری بہت بڑھی تو حکیم کو بھی اندر جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ دفن کے بعد گوروں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے گھوڑوں سے قبر کو اس طرح زمین کے برابر کر دیں کہ نام و نشان تک باقی نہ رہے انھوں نے اس کی خود پیشن گوئی کی تھی ؎

پسِ مرگ، قبر پہ اے ظفر کوئی فاتحہ بھی کہاں پڑھے
وہ جو ٹوٹی قبر کا تھا نشاں اوسے ٹھوکروں سے اُڑا دیا

انگریزوں نے اس بات سے بھی ممانعت کر دی تھی کہ نہ کوئی قبر پر جائے اور نہ فاتحہ پڑھے۔ مرحوم بادشاہ نے ایک شعر میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا تھا فرماتے ہیں ؎

کوئی آ کے پھول چڑھائے کیوں   کیوں آ کے شمع جلائے کیوں
کوئی بہر فاتحہ آئے کیوں   میں وہ بے کسی کا مزار ہوں

---

[1] بحوالہ مہدی حسن صـ ۶۷ - ۶۸

غالب نے بہادر شاہ کی وفات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :

"۷ر نومبر ۱۸۶۲ء مطابق ۱۴ر جمادی الاول سال حال، جمعہ کے دن ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ اور قید جسم دونوں سے آزاد ہو گئے۔ انّا للہ و انّا الیہ راجعون"

کہنے کو یہ چند لفظ ہیں لیکن ان کے پیچھے درد ہی درد ہے۔ یاس ہی یاس ہے ؎

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب

بغاوت کے زمانے میں جب جرنیلی حکم نافذ تھا۔ غالب کے بھائی مرزا یوسف کو انگریزوں نے گولی مار کے ہلاک کر دیا۔ ہمیں یہ اطلاع معین الدین حسن خاں کے روزنامچے سے ملی ہے جو شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہو چکا ہے لیکن غالب نے اس کا ذکر نہیں کیا کہ وہ انگریزوں کی گولی سے ہلاک ہوئے۔ انھوں نے دستنبو میں صرف یہ لکھا ہے :

"۱۹ر اکتوبر کو پیر کے دن وہ کم بخت دربان بھائی کے مرنے کی خوش خبری لایا۔ کہتا تھا کہ وہ گرم رفتار راہ فنا (یعنی یوسف مرزا) پانچ دن تیز بخار میں مبتلا رہا اور آدھی رات کے قریب اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ پانی۔ غسال۔ رومال۔ گورکن۔ اینٹ۔ چونے۔ گارے وغیرہ کا ذکر چھوڑیئے۔ یہ بتایئے کہ میں کیسے جاؤں اور میت کو کہاں لے جاؤں۔ کس قبرستان میں سپرد خاک کروں۔ بازار میں اچھا بُرا۔ کسی قسم کا کپڑا نہیں ملتا۔ زمین کھودنے والے مزدور گویا کبھی شہر میں تھے ہی نہیں۔ ہندو اپنے مردوں کو دریا کنارے لے جا کر جلا سکتے ہیں لیکن مسلمانوں کی کیا مجال ہے کہ وہ دو تین شخص ساتھ راستے سے گزریں پھر جائے کہ میت کو شہر سے باہر لے جائیں۔

پڑوسیوں نے میری تنہائی پر رحم کیا اور اس کام کو انجام دینے

کے لیے تیار ہوئے۔ پٹیالے کے ایک سپاہی کو آگے کیا۔ میرے دو نوکروں کو ساتھ لیا اور چل دیے۔ میت کو غسل دیا۔ دو تین سفید چادریں اس گھر سے لے گئے۔ ان میں لپیٹا اور اس مسجد میں جو مکان کے برابر تھی۔ زمین کھودی۔ میت کو اس میں رکھا اور اس گڑھے کو پاٹ کر لوٹ آئے۔"

۱۸ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوگیا لیکن یہ تاریخ کی بڑی ہولناک لڑائی تھی۔ اہلِ دہلی نے بڑی ہمت اور بہادری سے ایک ایک انچ کے لیے جان دی۔ اور پورا شہر رزم گاہ میں تبدیل ہوگیا۔ ہڈسن نے لکھا ہے کہ ہم ان بدمعاشوں کا صحیح نشانہ مارنے اور توپوں کے تیز چلانے میں مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ فتح کے بعد قتل عام شروع ہوگیا۔ ہر مسلمان کو باغی قرار دیا گیا اور پوری آبادی شہر سے نکال دی گئی۔ یہ تجویز بھی تھی کہ سارے شہر کو تہہ خاک اور جامع مسجد کو مسمار کردیا جائے تاکہ بقول اوٹرم مسلمانوں کو عبرت ہو اور ان کے مذہب کی تذلیل ہو۔ یہ بھی تجویز تھی کہ فتح پوری کی مسجد میں فوج کو ٹھہرایا جائے اور زینت المساجد میں ایک بڑا تنور خانہ قایم کردیا جائے۔ اس وقت غالب پر جو چراغ صبح کی مانند تھے کیا گزری ہوگی اس کا اندازہ ناممکن ہے۔ ایک دور ختم ہوگیا تھا اور دوسرا شروع ہوا تھا جو پہلے سے قطعی مختلف اور معاندانہ تھا۔ غالب نے دستنبو میں لکھا ہے:۔

"جن کو پھانسی دی گئی ہے ان کی تعداد فرشتۂ موت ہی جانتا ہے۔"

محض پھانسی ہی نہیں دی گئی بلکہ بعضوں کی کھال کھینچ لی گئی، بعض کو زندہ جلا دیا گیا۔ بعض کو توپ کے منھ سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ بعض کو قید میں سڑا دیا گیا۔ غرض انگریزوں کے انتقامی مظالم سے "جان و مال و ناموس و مکان و مکیں و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے۔"

غالب، بیگمات قلعہ کے متعلق لکھتے ہیں:

"تم یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہِ دو ہفتہ کی سی۔ کپڑے میلے۔ پائنچے لیر لیر جوتیاں ٹوٹی۔"

اپنے متعلق لکھتے ہیں: ؎

تو بے کسی و غریبی ترا کہ می پرسد

"نہ جزا۔ نہ سزا۔ نہ نفریں۔ نہ آفریں۔ نہ عدل۔ نہ ظلم۔ نہ لطف۔ نہ قہر۔"

میر ابراہیم علی خاں سورتی لکھتے ہیں:

"خداوند نعمت کیا تم دہلی کو آباد سمجھتے ہو ..... کالے صاحب کا گھر اس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جھاڑو پھیر دی ہو۔ کاغذ کا پرزہ، سونے کا تار۔ پشمینہ کا بال باقی نہیں رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کا مقبرہ اجڑ گیا۔ ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی۔ اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر۔"

یوسف مرزا کو لکھتے ہیں:

"یں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندان کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔ یہاں اغنیا و امراء کے اولاد و ازدواج بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں۔"

دہلی کی بربادی سے متعلق میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

"مسجد جامع سے راج گھاٹ تک بے مبالغہ ایک صحرائے لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں اگر اٹھ جائیں تو ہو کا مکان ہو جائے۔"

اس خط میں لکھا ہے:

"واللہ دلی اب شہر نہیں۔ کیمپ ہے چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر

نہ بازار نہ نہر"

۵ / اکتوبر ۱۸۵۷ء کو چند گورے غالب کے مکان میں گھس آئے اور ان کو گرفتار کر کے کرنل براؤن کے سامنے لے گئے اس وقت کسی مسلمان کو شہر میں رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ کرنل براؤن نے پوچھا "تم مسلمان ہو" مرزا نے کہا۔ آدھا۔ فرمایا کیا مطلب؟ کہنے لگے شراب پیتا ہوں سور نہیں کھاتا"۔

یہ گرفتاری اور باز پرس معمولی بات نہیں تھی۔ دلی کے احکام، قضا و قدر کے احکام تھے۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور نقش جادہ نظر نہیں آتا تھا لیکن انھوں نے اس پل صراط پر بھی۔ ظرافت کا ساتھ نہیں چھوڑا اور ہمیں ظلمت کے برداشت کرنے کا اہل بنایا۔ اس شکست اور اضطراب کے زمانے میں جب موج خون ہمارے سر سے گزر رہی تھی۔ انھوں نے ہمیں ایک حوصلہ اور ہمت عطا کی۔ یہ فضا مادی ترقیوں کے لیے سازگار نہیں تھی۔ اب سرشکری کا موقع نہیں تھا۔ صرف سخن گستری کا موقع تھا۔ وہ خود کہتے ہیں۔ آئینہ زدودن وصورت معنی نمودن نیز کار نمایاں است۔ یہی وجہ ہے کہ توانیوں کا علم ان کے قلم میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس قلم میں تلوار کی سی تیز روشنی اور برش ہے۔ اسی طرح ان کی ظرافت میں وہ شوخ اور ذہین ذہانت اور دیدہ وری ہے جو پیکر الفاظ میں روح پھونک دیتی ہے۔ ایک فلسفیانہ بے نیازی ہے۔ کلیت اور مرثیت نہیں۔

غدر کے بعد غالب کے سارے ذرایع آمدنی مسدود ہو گئے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ۵۲ برس کا پنشن۔ تقرر اس کا بہ تجویز لارڈ لیک و بہ منظوری گورنمنٹ۔ اور پھر نہ ملا ہے۔ نہ ملے گا۔ خیر احتمال ہے ملنے کا۔ علی کا بندہ ہوں۔ قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا۔ اس وقت کلو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں۔ بعد اس کے نہ کہیں قرض کی امید ہے۔ نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل۔

غالب نے مجبور ہو کر انگریز حکام کو پنشن کی بازیابی کے لیے لکھا۔ قصیدے نظم کیے۔ عرضیاں بھیجیں اور ۱۸۶۰ء میں جا کر پنشن کا کچھ روپیہ وصول بھی ہوا۔

رام پور کی سرکار نے بھی سو روپے ماہوار مقرر کر دیے تھے لیکن ان مواقع پر غالب کو خاصے خوشامدانہ خطوط لکھنے پڑے اور بندگی میں بھلا نہ ہونا عبد اور معبود کے لیے شرمناک ہے۔

غدر کے بعد غالب ایک عرصہ تک پنشن خلعت و خطاب اور دربار و لمبر کے قضیے میں گرفتار رہے۔ جب ان الجھنوں سے کچھ نجات ملی تو وہ عوارض فساد خون میں مبتلا ہو گئے اور پھوڑوں کی کثرت سے سر و خراغاں ہو گیا اور طاقت نے جواب دے دیا۔ وہ جون ۱۸۶۳ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"۱۲۷۷ھ میں میرا نہ مرنا صرف میری تکذیب کے واسطے تھا مگر اس تین برس میں ہر روز مرگ نو کا مزا چکھتا رہا ہوں ..... روح میری اب جسم میں اس طرح گھبرائی ہے جس طرح طائر قفس میں۔ کوئی شغل۔ کوئی اختلاط۔ کوئی جلسہ۔ کوئی مجمع۔ پسند نہیں کتاب سے نفرت۔ شعر سے نفرت۔ جسم سے نفرت۔ روح سے نفرت۔ جو کچھ لکھا ہے بے مبالغہ اور بیان واقع ہے۔

خرم آں روز کزیں منزلِ ویراں بردم "

آخر عمر میں مرزا غالب کو مالی دشواریوں اور مسلسل بیماریوں نے زندہ درگور کر دیا تھا لیکن اس حیوان ظریف کی بذلہ سنجی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مرنے سے ایک دن پہلے نواب علاؤالدین لوہارو نے حال پوچھا تھا۔ انھیں جواب دیا۔

"میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا۔

دم واپسیں بر سر راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے"

غالب نے کبھی مصائب کے آگے ہار نہیں مانی اور وہ ہر حال میں پُر اُمید رہے۔ ان کی انسان دوستی۔ ان کی دردمندی۔ ان کی فراخ دلی۔ ان کی دیدہ وری۔ ان کی سنجیدہ ظرافت اور ان کی شگفتہ متانت ہماری تہذیب کا بہترین سرمایہ اور ان کی شخصیت ہمارے ادب کی سب سے دل کش اور قد آور

شخصیت ہے ـــــ

قمریاں پاس غلط کردۂ خودی دارند
ورنہ ہیچ سرو دریں باغ باندام تو نیست

ان کی یہ غزل لکچروں کا اختتامیہ ہے نے عہد جدید کا اعلان اور صبح عید کی نوید ہے۔ انھوں نے نئے زمانے کی اور نئی قدروں کی اس وقت تائید کی اور صبح کی بشارت دی جب سرسید اور رام چندر کو بھی اس کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ پہلے میں ان کے اشعار کو پڑھوں گا بعد میں ترجمہ کروں گا:

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند وز خورشید نشانم دادند
رخ کشودند ولب ہرزہ سرایم بستند
دل ربودند و دو چشم نگرانم دادند
سوخت آتش کدۂ ز آتش نفسم بخشیدند
ریخت بت خانۂ ز ناقوس فغانم دادند
گہر از رایت شاہان عجم برچیدند
بعوض جامۂ گنجینۂ فشانم دادند
افسر از تارک ترکان پشنگی بردند
بہ سخن ناصیۂ فر کیانم دادند
گوہر از تاج گسستند و بدانش بستند
ہرچہ بردند بہ پیدا بہ نہانم دادند

اُنھوں نے مجھے اندھیری رات کے اندھیرے میں صبح ہونے کی خوش خبری دی۔ انھوں نے شمع بجھا دی اور سورج کے طلوع ہونے کی طرف اشارہ کیا۔ جب آتش جل کر راکھ ہو گیا تو مجھے

آتش کی جگہ نفس یعنی زبان دی۔ اور جب بت خانہ گر گیا تو مجھے ناقوس کی جگہ آہ وفغاں دے دی۔ شاہانِ عجم کے جھنڈوں کے موتی اتار لیے اور اس کے عوض میں مجھے خامۂ گنجینہ فشاں عنایت کیا۔ اسی طرح ترکوں کے سر سے تاج لوٹ لیا اور مجھ کو شاعری میں اقبال کیانی مرحمت فرمایا۔ تاج میں سے موتی توڑ لیے ان کو علم و دانش میں جڑ دیا۔ یعنی جو کچھ علی الاعلان لوٹا تھا وہ مجھے چپکے سے دے دیا۔